دوش بدوش

اسعد گیلانی

ادب اسلامی پبلیکیشنز

دوش بدوش

اسعد گیلانی

ادبِ اسلامی پبلیکیشنز
دارالاسلام کالونی
ملتان روڈ۔ لاہور

تصنیف ——— دوش بدوش
صاحبِ تصنیف ——— اسعد گیلانی
پبلشر ——— ادبِ اسلامی پبلیکیشنز - دارالاسلام کالونی ملتان روڈ۔ لاہور
پریس ——— وفاق پرنٹنگ پریس لاہور
ضخامت ——— ۲۵۶ صفحات
سنِ اشاعت ——— جولائی ۱۹۷۴ء
خوشنویس ——— عبدالقادر قیصر مغلپورہ لاہور
قیمت ——— آٹھ روپے صرف

اسلام پسند نوجوانوں کا ادب

دوش بدوش

مندرجات

انتساب

اُسی کے نام جسے یہ خطوط لکھے گئے

اسعدؔ گیلانی

اسعد گیلانی کے مکاتیب

اُن کی اہلیہ ——— اُمّ فاروق

کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

اس مجموعے کے خطوط ایک نوجوان لڑکے نے ایک نوجوان لڑکی کے نام لکھے تھے۔ اس حد تک تو یہ خطوط اور ان کی اشاعت سخت قابلِ اعتراض ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ ان دونوں کا شرعی نکاح ہو چکا تھا البتہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس سے اعتراض کچھ ہلکا ہو جاتا ہے البتہ کھٹک پھر بھی باقی رہ جاتی ہے اس لئے کہ ایسے خطوط اشاعت کے لیے کبھی نہیں دیئے جاتے چونکہ نہ تو وہ اشاعت و طباعت کے تصوّر کے تحت لکھے جاتے ہیں اور نہ ہی اپنی رازداری کے نکتۂ نظر سے اس امر کے متحمل ہوتے ہیں کہ وہ ان دو افراد کے علاوہ کسی تیسرے کی نظر سے گزریں۔ لیکن میں ان مکاتیب کو لکھے جانے کے تقریباً ۲۰ سال بعد خود اپنی زندگی میں ہی اشاعت کے لئے دے رہا ہوں اس لیے کہ خود میں نے ہی یہ خطوط اپنی بیوی ام فاروق کے نام لکھے تھے۔ محض اس لئے کہ میرے خیال میں ان خطوط میں ایسا مواد موجود ہے جو تحریک کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ نو بیاہتا جوڑوں کیلئے بھی ان میں رہنمائی ہے اور نوجوان لڑکے لڑکیوں اور طلباء و طالبات کے لئے بھی ان میں سبق ہے۔ اس سبق اور رہنمائی کی خاطر میں نے اپنی بیوی کے نام اپنے

پرائیویٹ خطوط کی اشاعت کو گوارا کر لیا ہے۔ بس میں نے ان پر معمولی اور مناسب حد تک نظرثانی کر لی ہے اور ان میں سے ضرورت سے زیادہ پرائیویسی نکال دی ہے۔

تحریک اسلامی میں نوجوانوں کے لئے لٹریچر کی سخت قلت ہے۔ خصوصاً ہلکا پھلکا تفریحی لٹریچر تو نایاب ہے اور ٹین ایجبر (TEENAGER) چاہے وہ کسی ملک وملت اور کسی خاندانی پس منظر کے اندر بھی موجود ہو اس کے طبعی مزاج کی افتاد اور مانگ مقالات سے زیادہ تفریحی اور ہلکے پھلکے ادب کی ہوتی ہے۔ اس مانگ کو پورا نہ کیا جائے تو وہ کھانا گھر میں کھاتے ہیں اور ریڈیو ہوٹل میں جا کر سنتے ہیں جو تعلیم و تربیت کے سارے نظام کو ادھورا نامکمل اور غیر مؤثر بنا دیتا ہے۔ زندگی میں دورنگی اسی مرحلے سے داخل ہو جاتی ہے۔ تحریک میں ایسے لٹریچر کی کمی نے نوجوانوں میں مطالعۂ ذوق کی بھی دورنگی پیدا کر دی ہے، جو آگے چل کر عمل و فعل کی دورنگی بن کر نمودار ہوتی ہے۔ میں اس ضرورت کو ایک مدت سے محسوس کر رہا ہوں اور منتظر ہوں کہ کوئی طباعتی ادارہ اسلامی ادب کے تفریحی شعبے کی طرف متوجہ ہو اور نوجوانوں کیلئے ان کی اس مزاجی ضرورت کا اہتمام کرے۔ لکھنے پڑھنے کی حد تک مجھ سے جو کچھ ہو سکا ہے وہ میں نے اب تک کیا ہے لیکن سیلاب کو تنکے سے اور ہاتھی کو تار عنکبوت سے تھاما نہیں جا سکتا اور نہ بھوک کو ایک دانۂ خشخاش سے مٹایا جا سکتا ہے۔

پاکستان بننے سے پہلے کے لکھے ہوئے ان خطوط کو اتنی مدت تک محفوظ رکھنے کا کام حفاظت واحتیاط کا زبردست کام تھا جو میری بیوی ام فاروق نے سرانجام دیا ہے اور اتنے بوسیدہ اور کٹے پھٹے خطوط کو ٹائپ کر کے اشاعت کے قابل بنانے کا کام سخت دشوار اور جان لیوا کام تھا جو عزیزم محمد خالد ٹائپسٹ نے سرانجام دیا ہے جو

میرے محترم رفیق مولانا شمس الدین ساہیوال کے صاحبزادے اور ہونہار نوجوان ہیں۔
یہ دونوں کام نہ ہوئے ہوتے تو شاید یہ خطوط کبھی اشاعت کے قابل نہ ہو سکتے تھے
یہ دونوں حضرات میرے شکریے کے مستحق ہیں۔ میں نے اپنی حد تک یہ کام کیا ہے کہ اپنی پرائیویٹ
چیز کو افادہ عام کے لیے دل پر جبر کر کے شائع کر دیا ہے اور ان خطوط پر تھوڑی سی
محنت کر کے ان کی نظر ثانی کر دی ہے۔ اس کا مقصد صرف نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں
کو ان کے حقیقی مقصدِ زندگی سے متعارف کرانا ہے۔ اگر ان خطوط کی اشاعت سے
نوجوانوں کو کچھ ذہنی رہنمائی اور جستجوئے حق میں کچھ مدد ملے گی تو یہی میرا حاصلِ محنت
اور انعام ہوگا۔ یہ خطوط دعوتی خط و کتابت کے لیے نمونے کا کام بھی دیں گے۔

ان ۳۰ مکاتیب میں سب سے پہلا خط ۵ جنوری ۱۹۴۶ء کو دہلی سے لکھا گیا ہے اور آخری
خط ۲۱ دسمبر ۱۹۴۷ء کو حافظ آباد سے تحریر کیا گیا ہے۔ گویا یہ سارے خطوط ایک سال گیارہ
ماہ اور چھ دن کے عرصے میں لکھے گئے ہیں۔ یہ سارا زمانہ نہایت پرآشوب دور ہے۔ ہم دونو
کے لیے بھی ہمارے خاندانوں کے لیے بھی ہماری قوم کے لیے بھی اور خود ہمارے ملک کے لیے
بھی۔ اس پرآشوب دور میں سے وقت کی گنجائش نکال کر اپنی شریکِ زندگی تک دعوت
دین کی بات پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہر انسان کی یہ بڑی فطری خواہش ہے کہ اس کا
شریکِ زندگی اس کے خیالات سے ہم آہنگ ہو اس فطری خواہش نے ان مکاتیب میں
ایک سعیٔ مشکور کا رنگ اختیار کیا ہے اور الحمد للہ کہ وہ رنگ پختہ اور کامیاب ہے۔ نوجوانوں
کے لیے ان مکاتیب میں ایسی سعیٔ مشکور کرنے کی وافر دعوت اور اس کا انداز موجود ہے۔

اسعد گیلانی

لاہور
۲۳ جون ۱۹۷۴ء

رُخصتی سے پہلے

۱

—— یہ خط دیکھ کر تمہیں حیرانی ہوگی بلکہ کچھ پریشانی بھی۔ اطمینان رکھو میں نے بی بی جان سے اجازت حاصل کرلی ہے۔ ان کی اجازت سے ہی یہ خط لکھ رہا ہوں۔ میں نے ان سے عرض کیا تھا کہ غائبانہ مکالمے اور مخاطبت سے ذہن قریب تر آجاتے ہیں اور خیالات میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ خیالات کی ہم آہنگی ازدواجی زندگی کو رحمت، مُوَدّت اور سکون سے ہمکنار کرنے کے لئے معاون ہوتی ہے۔ میری اس دلیل کو انہوں نے تسلیم کرلیا۔ ان کے خیال میں بھی اس بات میں مستقبل کی خوبی کی علامت موجود ہے۔ چنانچہ ان کی اجازت اور اپنی اُپج سے یہ خط تحریر کر رہا ہوں۔

ابھی ہم رُو در رُو شاید ایک سال تک نہ مل سکیں گے۔ اس دوران میں اگر تم پسند کرو کہ ہم قلم و قرطاس کے حجاب کے پیچھے سے ایک دوسرے سے باتیں کرلیا کریں تو یہ کوئی ایسی اچنبھے کی بات بھی نہ ہوگی اور نہ ہی غیر مناسب۔ نکاح اور رخصتی کے درمیانی وقفہ میں اگر اس سے پہلے کسی نے یہ فائدہ نہ اٹھایا ہو تو چلو ہم اٹھالیں۔ یوں بھی ایک دوسرے کے دل و دماغ اور باتوں کے رنگ و روپ سے آگاہی ہم دونوں کے لئے مفید ہی ہوگی۔ اس لئے میں تم سے یہ تقاضا ضرور کروں گا کہ تم میرے اس خط کا جواب ضرور دو۔ جواب دو گی تو پھر یہ سلسلہ رواں دواں رہے گا تا آنکہ قافلۂ انتظار منزل تک پہنچ جائے۔

دفتر میں ایک صاحب آج ایک شعر سنا رہے تھے۔

ع سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اس دعا کے بعد

مجھے یہ شعر بہت پسند آیا بس یہی شعر "ہدیہ" ارسال ہے ۔۔۔۔

نئی دہلی ۱۵ جنوری ۴۶ء

---

(۲)

۔۔۔ خیال تھا کہ تمہاری طرف سے جواب خط کا انتظار کر کے دوسرا خط لکھوں گا لیکن معلوم ہوا کہ انتظار کو موت سے شدید تر کہنے والے لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ چنانچہ انتظار کو مستقبل کے حوالے کر کے آج پھر خط لکھنے بیٹھ گیا ہوں تا کہ تھوڑی دیر دل کی باتیں بھی ہو جائیں۔

کل چھ کتابچے ارسال کیے تھے۔ امید ہے کہ تمہیں پسند آئیں گے اور جو نہ آئیں تو میری دعا ہے کہ تم انہیں پسند کرنے لگو۔ کل جامع مسجد دہلی کے اردو بازار میں بہت سے کتب خانے دیکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ کتابیں خریدنے کے پختہ ارادہ کے باوجود میں ایک بھی کتاب نہ خرید سکا۔ اردو میں اس وقت جو ادب پیدا ہو رہا ہے اخلاقی حیثیت سے اتنا گرا ہوا ہے کہ میرے لئے تو وہ سارے کتب خانے خالی تھے۔ تقریباً خالی ہاتھ واپس آنا پڑا۔ صرف ایک کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" خرید لایا ہوں۔ انتخاب کتب کا مرحلہ بھی بڑا سخت ہوتا ہے۔ اس وقت اردو میں کوئی ایسا صنف نظر نہیں آتا جس کے لٹریچر کو ادبی پاکیزگی اور اخلاقی بلندی کا شرف حاصل ہو۔ عورتوں کیلئے

لکھنے والوں میں مولانا راشد الخیری کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے۔ بلاشبہ وہ خوب لکھتے ہیں لیکن ان کے پاس غم واندوہ بہت ہے۔ اردو لٹریچر میں مسلمان بچیوں اور خواتین کے لئے صحیح اسلامی روح کا فقدان ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں جو ماحول اور معاشرت اسلامی معاشرت اور اسلامی ماحول کے نام سے رائج ہے، کیا واقعی اسے اسلام سے کوئی نسبت ہے؟ مجھے تو اس میں شک ہے۔ اس رنگ میں ڈھلنے اور ڈھالنے کی کوشش میرے نزدیک تو کوئی اسلامی خدمت نہیں ہے۔ مولانا راشد الخیری عورتوں کے لئے اگرچہ اچھا لکھتے ہیں لیکن تمہارے لئے اچھی کتابوں کا انتخاب کرتے ہوئے مجھے ان کے لٹریچر میں بھی خاصی دقت ہوئی۔ اسلام کا وہ تصور جو زندگی آموز ہو آج کہاں ہے؟ خواجہ حسن نظامی جن خیالات کے داعی ہیں وہ خیالات ہماری اسلامی روح اور جذبہ کو سرد کر دینے والے ہیں۔ مچھر دھوبی اور کپڑے کی باتوں میں آخر زندگی کے کون سے عقدوں کا حل ہے۔ صرف پانچ نمازیں رسمی طور پر پڑھ لینے اور کسی پیر صاحب کی عقیدت کا اعتراف کر لینے سے ہی تو مسلمانی کے تقاضے پورے نہیں ہو جاتے مسلمان تو وہ ہے جو زندگی میں دکھ اور مصیبت کے ساتھ' بھوک اور رسوائی کے باوجود ہر حالت میں صرف اللہ ہی کا حکم ماننے اور اللہ کا حکم ماننے سے جو چیز بھی اسے روکے' اسے چھوڑ دے۔ چاہے دنیوی لحاظ سے وہ اسے کتنی ہی عزیز اور محبوب کیوں نہ ہو۔ جب تک ہم میں یہ روح پیدا نہ ہو ہماری مسلمانی کے دعوے اوپرے دعوے اور پانی کے بلبلے ہیں۔ جو قلم خدا کی راہ میں حرکت نہ کرے۔ جو زبان مالک کی راہ میں نہ بولے۔ جو جسم آقا کے راستے میں دکھ نہ سہے۔ جو دل اس کے راستے میں نہ تڑپے۔ وہ قلم توڑ دینے' وہ زبان کھینچ لینے وہ جسم مٹا دینے' اور وہ دل پہلو سے نکال پھینکنے

کے قابل ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے قلم خدا کی راہ سے ہٹ کر پیٹ کی باتیں، حرص و ہوا کی باتیں، زر و مال کی باتیں اور عیش و عشرت کی باتیں کرتے ہیں تو پھر میں تمہارے لئے ایسی کتابیں کیونکر خریدوں اور تمہیں کیسے بھیجوں۔

جو کتب میں نے ارسال کی تھیں تم ان کا گہری نظر سے مطالعہ کرو۔ ان میں "خطبات" اور "اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر" خاص طور پر قابل غور ہیں۔ جب تک ان کا مطالعہ کرتی ہو میں اطمینان سے انتخاب کر کے دوسری کتب بھیجنے کی کوشش کروں گا۔ جو دلچسپ بھی ہوں گی اور خیال افروز بھی۔

نئی دہلی ۲۸ جنوری ۱۹۴۶ء

۳

—— تمہارا پہلا خط آج ملا۔ بے پایاں مسرت کے جھولے میں آج دن بھر جھولتا رہا ہوں۔ تم نے چھوٹی چھوٹی دلچسپ اور معصوم باتیں لکھی ہیں۔ تم نے موجودہ سرکاری ملازمت کے بارے میں میری رائے پوچھی ہے۔ انگریز کے قائم کئے ہوئے باطل نظام کے تحت ملازمت کے بارے میں میری رائے تو بالکل صاف اور واضح ہے۔

تم جانتی ہو کہ ہم بحیثیت مسلمان اسلام کی پیروی کے دعویدار ہیں۔ لیکن اسلام چند رسوم یا چند دینی عبادات کے مجموعے کا نام تو نہیں ہے یہ تو ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ مسلمان کی حیثیت سے ہم اپنے جسم، دل و دماغ اور زندگی کا کوئی ایک گوشہ بھی اسلام کے

دائرے سے باہر نہیں رکھ سکتے۔ جس طرح ہم مسجد میں مسلمان ہوتے ہیں، اسی طرح بازار اور گھروں میں بھی مسلمان ہی رہتے ہیں۔ مسلمان' یعنی خدا کا فرمانبردار بندہ ہونے کی حیثیت سے ہمارا اسلامی فرض یہ ہے کہ خدا کے صادر فرمائے ہوئے اس قانون یعنی اسلام کو سب سے پہلے اپنی زندگی پر پوری طرح نافذ کریں اور پھر دنیا میں اسے نافذ کرنے کی پوری کوشش کریں۔ کیوں کہ ہم کلمہ طیبہ کا مضبوط عہد خدا کے ساتھ باندھے ہوئے ہیں۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا کے سب نظام اور قوانین باطل ہیں اور ایک خدا کا بھیجا ہوا یہ نظام اور قانون ہی برحق ہے۔ اب ہمارے اس ملک میں خدا کا قانون تو موجود نہیں ہے اس کی بجائے ایک دوسرا ہی باطل قانون اور نظام زندگی مسلط ہے جو خدا کی بغاوت پر مبنی ہے اب ہمارا سیدھا سادا اسلامی فریضہ تو یہی ہے کہ اس باطل قانون کو ہٹا کر اس کی جگہ خدا کا قانون اور قرآنی نظام قائم کریں۔ یہ فرض مسلمان مردوں عورتوں بچوں بوڑھوں اور جوانوں سب پر مساوی طور پر عائد ہوتا ہے لیکن ہم موجودہ حالات میں کیا کر رہے ہیں؟ یہی کہ اس باطل نظام میں نوکریاں کر کے اسے اور تقویت پہنچاتے ہیں۔ خدا کے نظام کے خلاف موجودہ نظام کے ساتھ مل کر اس سے تنخواہیں لیتے ہیں اور اپنی زبانیں' قلم' دماغ جسم اور قویٰ اس کے پاس بیچتے ہیں۔ کہیں یہ چیزیں چند روپے کے چپڑاسی کی حیثیت سے بکتی ہیں اور کہیں سینکڑوں روپے کے افسر کی حیثیت سے۔ حالانکہ خدا کی بخشی ہوئی طاقتوں کو خدا کے نظام کے باغی نظام کی خدمت میں لگانا جتنا بڑا جرم ہے اس میں چپڑاسی اور افسر دونوں اللہ کے دربار میں برابر کے مجرم ہیں۔ کسی غیر اسلامی نظام کی مشینری کا پرزہ بن کر اس کی خدمت کرنا کبھی مسلمان کا شیوہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔ سکھ کبھی کسی مسجد کا خادم نہ بنے گا۔ کمیونسٹ کبھی کعبے کی حفاظت نہ کرے گا۔ لیکن مسلمان روٹی کے لئے

کفر کا خادم بن جائے اور پھر بھی اس کی اسلامیت میں کوئی فرق نہ آئے یہ تو بڑی عجیب بات ہے میں تو کہتا ہوں کہ یہ صریحاً عملی جھوٹ کا ارتکاب ہے۔ کفر کی خدمت کے ساتھ نہ ہم خدا کو خوش کر سکتے ہیں اور نہ وہ ہماری نمازوں اور روزوں کو قبول کر سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ میں انگریز کی اس ملازمت کو حرام سمجھتا ہوں اور اس کے کمائے ہوئے رزق کو مکروہ روزی خیال کرتا ہوں۔ اگر ہم کسی کے گھر سے چرا کر یا کسی کی امانت بازار میں بیچ کر کما لیتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہم جرم کرتے ہیں پھر کیا خدا کی بخشی ہوئی طاقتوں کو اس کے دشمنوں کے ہاتھ بیچ کر روٹی کمانا جرم نہیں ہے؟ یہ بات قابل غور ہے۔ اب ایسی صورت میں تم میری نوکری کی تفصیلات کیا پوچھتی ہو؟ یہ نہ تو میرے لئے کسی فخر کی چیز ہے اور نہ ہی مستقل اختیار رکھنے کی چیز۔ آج ہوں تو شاید کل نہیں رہوں گا۔ تنخواہ ترقی اور دوسری تفصیلات کا پھر کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟ کیا اس بات کی تفصیل جاننا چاہتی ہو کہ خدا کے خلاف بغاوت میں اعانت کے معاوضہ میں خدا کے دشمن مجھے کتنی دولت اور کتنا روپیہ دے رہے ہیں اور مزید کیا کچھ دینے کا وعدہ کر رہے ہیں؟ اس کی تفصیلات میں تمہیں کیا بتاؤں؟ میں تو اپنی اس پوزیشن کو بدلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس نوکری میں جتنی میری پوزیشن اونچی ہے اتنا ہی بڑا میں خدا کا مجرم ہوں۔

میں نے تجارت کا ارادہ ترک نہیں کیا ہے اس لئے کہ اس وقت تو صرف وہی ایک حلال ذریعۂ معاش نظر آتا ہے اگرچہ اس میں بھی بڑی بڑی دشواریاں ہیں۔ لیکن دشواریوں کا کیا پوچھتی ہو آخر رسولؐ پاک جن کے پاؤں کی خاک بھی ہمارے لیے عرش کی مانند ہے جَو کی روٹی کھاتے رہے موٹے کپڑے پہنتے رہے، دکھ سہتے رہے اور مصیبتیں برداشت کرتے رہے پھر ہم کس کھیت کی مولی ہیں کہ اسلام کی زبوں حالی

کہ اس دور میں عیش و آرام کی تمنا کریں۔ مسلمان کے لئے اس دنیا میں عیش و آرام کہاں ہے۔ اس لیے اس ملازمت کی تنخواہ اور ترقی کے بارے میں مجھ سے نہ پوچھو بخدا اسلامی حکومت میں مجھے چپراسی بلکہ اس سے بھی کمتر جگہ ملتی تو میں ہزار دل سے خوش ہوتا اور موجودہ باطل نظام میں اگر مجھے کوئی لاکھوں بھی دے تو مجھے شدت کا احساس ہے کہ میں خدا کا ایک مجرم ہوں۔

تم جانتی ہو کہ ہماری آج کی سوسائٹی کا سب سے بڑا نقص مغربی تہذیب سے مرعوبیت ہے۔ اس بد قماش تہذیب نے ہمارے خوب و ناخوب کے پیمانے تک بدل ڈالے ہیں۔ ایک چیز ہمیں اس لئے پسند ہے کہ وہ مغربی تہذیب میں پسند کی جاتی ہے اور دوسری اس لئے ناپسند ہے کہ مغربی تہذیب میں وہ ناپسند کی جاتی ہے۔ یہ تو ہم بھول ہی گئے ہیں کہ ہماری اپنی بھی ایک علیحٰدہ تہذیب ہے۔ مغربی تہذیب جن بنیادوں پر ہمیں اپنی زندگیاں استوار کرنے کے لئے کہتی ہے وہ بنیادیں مسلمانوں کے لئے تباہی کی بنیادیں ہیں۔ جو چیزیں مغرب کے لوگوں کے لئے باعثِ فخر ہیں وہ ہمارے لیے باعثِ شرم ہیں۔ ہمارے لئے تو قابلِ فخر خدا اور رسول ؐ کے احکام کی پیروی اور اسلامی طور وطریقے ہی ہیں۔ مغربی تہذیب سے ہمارے اندر "کالے صاحب لوگ" تو بہت پیدا ہوئے ہیں لیکن سچے اور مخلص مسلمان پیدا نہیں ہوئے۔ اور اگر کچھ ہوئے ہیں تو وہ مغربی تہذیب کی خرابیوں کے باوجود اپنی فطرتِ ابراہیمی کی بناء پر ہوئے ہیں لیکن اسلام میں تو وہی سب سے زیادہ فخر کے قابل ہے جس نے اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگ لیا اور اس کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہو۔ اسی لئے میں تو اس مردم خور تہذیب کی نوکری سے بالکل بیزار ہوں۔ آخر خدا اور رسولؐ کی غلامی کے ساتھ ساتھ دوسرے آقاؤں

کی غلامی کو کیسے نبھایا جا سکتا ہے یہ تو دو کشتیوں کی سواری ہے ۔ میں اب دو کشتیوں کی سواری چھوڑ کر بس ایک ہی کشتی میں منتقل ہونا چاہتا ہوں کیوں کہ دو منزلوں کا راہی ہمیشہ بھٹکتا رہتا ہے ۔

امید ہے کہ کتابیں مل گئی ہوں گی ۔ موجودہ تعلیم کے متعلق ایک چھوٹا سا پمفلٹ ارسال ہے "خطبۂ تقسیم اسناد" اسے ضرور غور سے پڑھ لینا ۔ بہرحال اطمینان رکھو۔ تاریکی کے بعد ہمیشہ روشنی آتی ہے ۔ ہماری زندگی میں بھی آہستہ آہستہ روشنی داخل ہو رہی ہے اسلامی افکار کی یہ روشنی ہم میں حوصلہ بے خوفی اور راحتِ قلب پیدا کرے گی ۔ اس سے ہماری زندگی کے بہت سے تاریک گوشے روشن ہو جائیں گے ۔ ہمیں اپنی زندگیوں کی تعمیرِ نو کرنی ہے ۔ جس تعمیر کی بنیادیں خدا ترسی پاکیزگی راستی خلوص اور بے لوث محبت پر رکھی جائیں گی ۔ ایسی پاکیزہ تعمیر ناقابلِ شکست ہوتی ہے ۔ اس تعمیرِ نو میں ہمیں دنیوی ترقی سے زیادہ اُخروی ترقی کا خیال رکھنا ہوگا ۔ ہمیں رزقِ حرام کے مقابلے میں رزق حلال کمانا ہے ۔ اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کی نظر میں ہم کس حد تک اس کے پیرو اور کس حد تک اس کے باغی ٹھہرتے ہیں ۔

دعا کرو کہ اللہ تعالٰے ہمیں رزق حلال عطا فرمائے اور باغیانہ روش سے بچائے اب رات کے گیارہ بج رہے ہیں اس لئے ختم کرتا ہوں ۔

نئی دہلی ۔ ۱۵ فروری ۱۹۴۶ء

۴

— مستقبل کے بہت سے افکار نے تمہیں پریشان کر رکھا ہے. حقیقی مستقبل تو آخرت ہے.
باقی کل کیا ہوگا وہ کل لانے والے کے ارادے کے مطابق ہو کر رہے گا۔ ہمارا کام کوشش کرنا ہے سو اس میں کمی نہ ہونی چاہیئے... خدا کا شکر ہے کہ تم حوصلے اور جرأت سے مستقبل کی ہر حالت پر قانع ہو۔ اُداسی سے قطع نظر کچھ دنوں کی ہماری یہ جدائی اور دوری بھی ہم دونوں کے لئے مفید ہی ہے۔

ع " وصل میں مرگِ آرزو ' ہجر میں لذتِ طلب "

ہجر میں انسان کو جدائی کی لذت نصیب ہوتی ہے وہ اس کے جذبۂ شوق کو پختہ اور سنجیدہ بنا دیتی ہے اور وصل اس تمنا اور آرزو کا جو برسوں سے دل میں پالی گئی ہو خاتمہ کر دیتا ہے۔ وہ لوگ جو خدا کی زمین پر جد و جہد کے قائل ہیں' منزل سے بڑھ کر راہِ منزل اور نقوشِ منزل کو پسند کرتے ہیں اس لئے کہ راستہ دل میں منزل کی تڑپ اور جد و جہد کا ذریعہ اور وسیلہ ہوتا ہے لیکن منزل پا لینے کے بعد راہرو اپنی اس انتہا کو پہنچ جاتا ہے جہاں جا کر اس کی جد و جہد اور اس کے ساتھ اس کی ہستی کا مفہوم ہی ختم ہو جاتا ہے. کش مکشِ پیہم کے اسی حسین تصور کو ذرا شعر میں دیکھو کہ کتنا لطیف معلوم ہوتا ہے۔

ے فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بے قرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را

عشق کو تو پختگی ہی جدائی میں نصیب ہوتی ہے۔

ایسی سوسائٹی اور محفل سے بہر صورت گریز اور اجتناب ہی کرنا چاہیئے جو انسان میں عیب جوئی اور عیب چینی کی عادت ڈالے۔ دینی مطالعہ کے ذریعے آدمی کو اپنے ضمیر میں ایک مستقل مضبوط اور پائیدار اخلاقی کسوٹی تیار کر لینی چاہیئے جو راستی صداقت اور اللہ و رسولؐ کی اطاعت پر موقوف ہو۔ بس تم اسی کسوٹی پر ہر شخص کی بات کو پرکھ کر دیکھو تو اگر اس کسوٹی پر وہ پوری اترے تو کہنے والا چاہے چھوٹا ہو یا بڑا ہر حالت میں وہ بات قابلِ قبول ہے اور اگر اس کسوٹی پر وہ پوری نہ اترے تو کہنے والا اپنے نام کے ساتھ دنیا کی بڑی سے بڑی عزت اور بڑائی کا دم چھلا بھی لگا کر آئے تو بھی وہ ناقابلِ قبول ہے۔ اس کسوٹی کو حاصل کرنے کے لئے اسلامی تعلیمات کا مطالعہ اور ضمیر کی زندگی اور صفائی کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس چیز کی جھلک تم میں موجود ہے یہ چیز میرے لئے بے انتہا مسرت کا باعث ہے۔ تمہاری یہ بات کہ "دوسروں کی خوشنودی کے لئے مصنوعی اور بناوٹی باتیں کرنا اپنے ضمیر کو دھوکا دینا ہے" مجھے بہت پسند آئی۔ میری مختصر سی شعوری زندگی کا ہمیشہ یہی مسلک رہا ہے۔ جو شخص ہماری مصنوعی اور بناوٹی باتیں سن کر خوش ہونا چاہتا ہے اور ہمارا ایمان اتنا سستا سمجھتا ہے کہ اس کی مسرت اور خوشی کے لئے بات کو کم و بیش کیا جائے تو اسے ہماری طرف سے صاف جواب ہونا چاہیئے کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسروں کو خوش کرنے کے لئے جو جھوٹ بولا جائے اس کی بجائے ہم اللہ پر بھروسہ کر سکتے ہیں کہ وہی رازق اور قادرِ مطلق ہے۔

ہاں ایک بات میں تم سے کہہ دوں کہ کسی شخص سے سوائے ایمان اور خدا کی اطاعت کے تقاضے کے ملاقات ترک کرنا مناسب نہیں ہے۔ اگر کسی سے ملنا ہمارے ایمان میں کمزوری کا باعث ہو تو اس کے مقابلے میں قیدِ تنہائی قابلِ ترجیح ہے کسی شخص سے میرے نزدیک تین بنیادوں پر ہی ملنا ترک کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ اس کی تیز نوکیلی اور طعنے دینے والی زبان سے ڈر کر ۔

۲۔ کسی کی برائی سے گھبرا کر ۔

۳۔ اور اس بات کے سبب کہ ایسی ملاقات اصولوں اور دین وایمان کے مخالف ہو اور اس طرح اسے اللہ کی راہ میں چھوڑا جائے ۔

پھر بھی ترکِ ملاقات کے لئے صرف تیسرا طریقہ ہی سچا اور صالح ہے۔ پہلی دونوں صورتوں میں فساد کی بو آتی ہے۔ کسی کی باتوں سے گھبرا کر اس کے طعنوں سے ڈر کر ترکِ ملاقات گویا اپنے دل میں اللہ کے خوف کے ساتھ ان لوگوں کا خوف بھی بٹھانا ہے۔ ایسے لوگ تو اصلاح کے حاجت مند ہوتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کے مطابق درجہ بدرجہ جن سے جو معاملہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے ہمیں اسی کے مطابق لوگوں سے معاملہ کرنا چاہیئے۔

یوں تو انسانی لحاظ سے ہم سب برابر ہیں اور جس میں ایمان زیادہ ہے بس وہی زیادہ لائقِ عزت ہے چاہے وہ سڑک پر ہی کیوں نہ سوتا ہو۔ جس ہمیشہ کی زندگی کی تیاری ہم موجودہ زندگی کے کمرۂ امتحان میں کر رہے ہیں اس کی کامیابی کا مدار عہدہ، مال و دولت اور بڑائی پر نہیں ہے بلکہ خدا کے ہاں وہی بڑا ہے جو اس کا سب سے زیادہ تابعدار بندہ ہے۔

یہاں دو دن میں تین بار بارش ہوئی ہے اور موسم خوشگوار ہو گیا ہے اور خوشگوار موسم میں لوگ باہمی ایک دوسرے کو یاد کیا کرتے ہیں۔

نئی دہلی ۔ ۲۲ فروری ۱۹۴۶ء

۵

۲۹ فروری کا لکھا ہوا تمہارا خط ملا۔ اللہ کا شکر ہے کہ تم بخیریت ہو۔ چکنے گھڑے والی مثال خوب رہی۔ پارٹی بازی کے اس دور میں اکثر لوگ اسی طرح کے ہو گئے ہیں۔ آنکھیں بند کر کے کچھ مخصوص خیالات اپنے ذہن میں بٹھا لیتے ہیں۔ غور و فکر کرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے، جیسے ڈرتے ہوں کہ غور کرنے سے اپنا موجودہ موقف بدلنا نہ پڑ جائے۔ حق بات سے انکار تو مشکل ہوتا ہے۔ اکثر لوگوں کو دیکھا ہے کہ گفت گو کے دوران حق بات کو نہ الٹ سکتے ہیں نہ رد کر سکتے ہیں بس بات بات پر جی ہاں درست ہے، ٹھیک ہے کہتے چلے جاتے ہیں اور جب بات ختم ہوتی ہے تو پھر وہی رجحانات وہی مشغلے اور وہی دلچسپیاں شروع ہو جاتی ہیں، بس یوں لگتا ہے جیسے دلوں پر مہریں ہیں اور جو کچھ سنتے رہے اوپر ہی اوپر ہوا کی طرح اڑ جاتا رہا ہے وہ دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھتے اور سنتے ہوئے بھی نہیں سنتے۔ خدا کا شکر ہے کہ تم موجودہ پارٹی بازی کے رجحانات سے بے نیاز ہو ورنہ آج کل تو ہر کوئی کسی نہ کسی پارٹی میں الجھا ہوا ہے۔ یہ پارٹیاں اپنے پیروؤں پر خاص قسم کے اصول پروگرام فرائض اور پابندیاں عائد کر کے ان پر اپنا جادو کر رکھتی ہیں۔ یوں تو اسلام بھی اپنے اندر ایک پارٹی کا پورا مزاج رکھتا ہے جس کا نصب العین دنیا میں خدا کی مکمل اطاعت اور اسلامی نظامِ زندگی کا قیام ہے اور مسلمان اس پارٹی کا خود بخود پیدائشی ممبر ہے، اس لئے مسلمان اپنے دین کے خلاف جانے والی کسی جماعت کا ممبر نہیں بن سکتا۔ اسی لئے میں تو حیران ہوتا ہوں کہ کس طرح مسلمان اسلامی جماعت کے ممبر ہوتے ہوئے بھی سیکولر پارٹیوں تک کے ممبر بن جاتے ہیں۔ جب کوئی شخص دو متضاد

پروگراموں والی پارٹیوں کا ممبر نہیں بن سکتا تو مسلمان اسلام یعنی حزب اللہ کا ممبر ہوتے ہوئے کسی دوسری غیر اسلامی پروگرام رکھنے والی جماعت کا ممبر کیسے بن سکتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یا اسے ایک جماعت پکڑنی ہوگی یا دوسری۔ اس لئے تمہارا یہ کہنا کہ مجھے اسلام کے سوا کسی پارٹی سے کوئی لگاؤ نہیں، میرے لئے مسرت کا باعث ہے۔ تمہارا یہ خیال کہ قرآن وسنت ہی ہمارے لئے ہدایات کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں اور حضورؐ ہی ہمارے ہادی، رہبر اور لیڈر ہیں بالکل سچی بات ہے۔ سب سے بڑی صداقت یہی ہے کہ قرآن جوامع الکتاب ہے وہی ہدایت اور نور کا سرچشمہ ہے۔

ابا جان کی پریشانیوں پر تمہیں ملازمت کی مجبوریوں کا احساس ہوتا ہے۔ دراصل اس دور میں یہ وہ غلامی کا طوق ہے جسے لوگ شوق اور فخر سے گلے میں ڈالتے ہیں اور دوسروں کو ڈالتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اللہ اکبر ذہن کتنے غلامی پسند ہو گئے ہیں جس بات پر شرم آنی چاہیئے تھی لوگ اس پر فخر کرنے لگے ہیں۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے۔
مسلمان نہیں راکھ کا ڈھیر ہے۔

نئی دہلی۔ ۵ مارچ ۴۶ء

۶

—— تمہارا خط کل ملا۔ یہ کیا بدحواسی ہے کہ اس دفعہ تم نے اپنے خط کو اللہ کے

نام سے شروع نہیں کیا "بسم اللہ الرحمن الرحیم" مومن کے ہر کام کی ابتدا ہوتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کی طرح یہ بھی بھول گئی ہو۔ خط نصف ملاقات ہوتی ہے گویا میرے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے تم سٹپٹا گئی ہو۔ تم نے لکھا ہے کہ جدائی محبت کو تیز تر کرتی ہے۔ بہت عمدہ اور سچی بات کہی ہے۔

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذتِ طلب۔

مادی جسم وصل کا طالب ہوتا ہے اور انسانی روح فراق کی متمنی، اور انسان ان دونوں کا اجتماعی وجود ہے اس لئے اس میں ان دونوں جذبات کی کشمکش موجود رہتی ہے البتہ ہجر سے رفعتِ فکر وصل کے مقابلے میں زیادہ حاصل ہوتی ہے۔

ان دنوں تمہارا گاؤں جانے کا ارادہ ہو رہا ہے ٹھیک ہے ذرا گاؤں کی آب ہوا میں صحت بہتر ہو جائے گی۔ پردے کی بات یہی ہے کہ میں اس کی شدت کا اس دور میں اور زیادہ شدت سے قائل ہوں میرا خیال ہے کہ تم بھی مجھ سے متفق ہو گی۔ جیسے بیماری کے دنوں میں حفظانِ صحت کا اور زیادہ خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

ایک واقعہ نظر سے گزرا۔ ایک نابینا صحابی حضورؐ کے مکان پر حاضر ہوئے۔ ضعیف آدمی تھے حضرت عائشہ رضؓ صدیقہ نے فرمایا کہ حضورؐ انہیں اندر ہی بلا لیں آخر بالکل نابینا ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا "اگر وہ نابینا ہیں تو تمہاری تو آنکھیں موجود ہیں۔"

بس اس سے پردے کا اسلامی معیار بخوبی سمجھ میں آجاتا ہے۔

گاؤں سے واپس آؤ گی تو بے تاب باتیں بہت سی جمع ہو چکی ہوں گی۔

نئی دہلی۔ ۷۔ مارچ ۱۹۴۶ء

۷

—— تمہارا عزیز خط ابھی ابھی ملا ہے جس کا مجھے پرسوں سے انتظار تھا۔ یہ سات مارچ کو لکھا گیا ہے اور آج ۱۱ مارچ کو مجھے ملا ہے۔ گویا مجھ تک پہنچنے میں اسے خطوط کے قافلے میں پیدل سفر کرنا پڑا ہے۔ ڈاکخانے والے بھی کبھی کبھی بے حسی کی انتہا کر دیتے ہیں۔

مردِ مومن دنیا میں ایک خاص مشن کا حامل ہے۔ اور وہ مشن ہے "اللہ کی اطاعت کی طرف ساری دنیا کو دعوت دینا۔ اس مشن کی ذمہ داری عورتوں پر اسی قدر ہے جس قدر مردوں پر۔ اس لحاظ سے ہر مومن پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ جس سوسائٹی میں بھی ہو اپنے اس مشن کو کبھی نہ بھولے۔ مومن کا کام سوسائٹی کو سنوارنا اور اسے دعوتِ دین سے متاثر کر کے اسلامی رنگ میں رنگنا ہے نہ کہ اس کے غلط رنگ میں خود بھی رنگ جانا۔ البتہ جو سوسائٹی اسے اپنے غلط رنگ میں رنگنا چاہے اس سے گریز ضروری ہے۔ اس لئے کہ مومن تو صرف صبغۃ اللہ میں ہی رنگ سکتا ہے اور اس پر کوئی دوسرا رنگ جو اللہ کے رنگ سے مختلف ہو چڑھنا حرام ہے۔ بہتر ہے کہ تم سہیلیوں اور عزیزوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھو البتہ اس میل ملاقات میں مندرجہ بالا معیار کا خیال کبھی فراموش نہ ہونا چاہیئے۔

پچھلے دنوں تمہارے خط کی تاخیر کے سبب تم بہت یاد آئی ہو۔ یاد بھی عجیب پُرکیف چیز ہے یہ ایک ایسا مقدس پرندہ ہے جو ایک دل کا پیغام دوسرے دل تک

غیر محسوس طریقے پر پہنچا دیتا ہے اور بیرونی دنیا کو اس کی کانوں کان خبر نہیں ہوتی - یاد کو روکا نہیں جاسکتا اس لیے کہ یہ کوئی خارجی شے نہیں ہے - خارج میں مطلوب ہوتا ہے اور داخلی سطح پر اس کی یاد ہوتی ہے - یاد کے پُر لطف پُر کیف ہونے سے کسے انکار ہے - تمہیں بھی انکار نہ ہوگا - انکار نہیں ہے تو ذرا جلد جلد خط لکھا کرو - میں منتظر رہتا ہوں -

نئی دہلی - ۱۱ مارچ ۱۹۴۶ء

---

(۹)

____ تمہارا خط ملا - تمہارے خطوط میں الفت کی آمیزش اور ایمان کی جھلک دونوں باتیں موجود ہوتی ہیں - یہ چیز میرے لئے بہت روح افزا ہے - اخبار کوثر تمہیں مل گیا ہے مسرت ہوئی - لیکن تمہارا خط بھی تسنیم سے کچھ کم نہیں ہوتا -

آج کل مطالعہ کس قسم کا ہو رہا ہے ؟ کوثر میں ایک عمدہ مضمون "اسلام اور کاروبار" آیا ہے - امید ہے کہ تم نے "سیاسی کش مکش" بھی ختم کرلی ہوگی - کیا میں کوئی دوسری کتاب بھجوا دوں - سید مودودی کی تصانیف کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک سے زیادہ بار پڑھنے سے بھی دل نہیں اکتاتا - اسلامی خیالات جتنے بھی دل و دماغ میں گہرے راسخ ہوتے جائیں مفید ہی ہے - آخر دین اسلام ہمارا اپنا دین ہے جس سے آگاہی ضروری ہے - مولانا مودودی نے مختلف موضوعات پر بہت عمدہ کتابیں لکھی ہیں

یاد آیا - کیا تم نے "تقویۃ الایمان" پڑھی ہے؟ جس کے مصنف شاہ اسمٰعیل شہید ہیں اگر نہیں پڑھی تو ضرور پڑھو عجیب چیز ہے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے میں انشاءاللہ بہت جلد بھجوا دوں گا۔

مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے صبغۃ اللہ کو ہی سب سے بہتر رنگ قرار دیا ہے اور اس میں رنگ جانے کا پختہ ارادہ بھی کر لیا ہے۔ صحیح پختہ رنگ تو وہی ہوتا ہے جو کپڑے کے ایک ایک تار پر چڑھ جائے اور کپڑے کا کوئی تاگہ بھی رنگ سے بچا ہوا نہ رہ جائے۔ جس کپڑے پر کہیں رنگ چڑھا ہوا اور کہیں نہ چڑھا ہوا سے ہم بھدا کہتے اور پسند نہیں کرتے۔ یہی حال انسان کا ہے اگر زندگی کے کچھ حصے پر اللہ کا رنگ موجود ہو کہ وہ نماز بھی پڑھتا ہو اور خدا ترس بھی ہو اور دوسرے حصے پر کسی دوسرے کا رنگ چڑھا ہوا ہو کہ وہ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کی غلامی بھی اختیار کئے ہوئے ہو تو ایسی زندگی دو رنگی اور دوغلی ہوتی ہے۔ انگریز کی سلطنت میں ہم ملازمت پیشہ لوگ اسی صورت حال سے دوچار ہیں اللہ کے رنگ کو ساری زندگی پر حاوی کرنے کیلئے ہمیں سخت بھٹی میں سے گزرنا ہوگا دکھ درد اور تکلیف کی بھٹی! تاکہ سب رنگ مٹ جائیں اور ایک ہی رنگ ساری زندگی پر حاوی ہو جائے۔ اس طرح اپنے آپ کو بھٹی میں چڑھا دینے کا نام ہی جہاد بالنفس ہے جو ہر مومن پر لازم ہے۔ اگر کبھی ایسا موقع آئے تو کیا تم میرے ساتھ اس بھٹی میں چڑھ سکو گی؟ مجھے یقین ہے کہ ہاں کیوں کہ ہم نے باہمی دکھ سکھ کا ساتھ دینے کا پختہ عہد کیا ہوا ہے اس عہد کو کبھی نہ بھولنا۔ عہد کی اللہ کے ہاں باز پرس ہوگی۔ جی ہاں سخت باز پرس!

نئی دہلی - ۱۷ مارچ ۱۹۴۶ء

۹

"—— تمہارا خط ملا - تمہارا مطالعہ جاری ہے - میرے لئے یہ بات اطمینان بخش ہے کہ تم نے ذہنی تبدیلی کے ساتھ ساتھ عملی تبدیلی کا بھی آغاز کر دیا ہے - تحریک کا سالانہ اجتماع ہونے والا ہے بہت سے لوگ جا رہے ہیں میں کیسے پیچھے رہ جاؤں - مجھے تو بہر حال جانا ہی ہے چھٹی کے لئے ابھی سے درخواست دے دی ہے۔

سلمیٰ کا امتحان کب ختم ہو رہا ہے؟ امتحان سے فراغت کے بعد اسے بھی رسالہ دینیات کا مطالعہ کروا دو - اگر اسے ان چھٹیوں کے لئے کتابوں کی ضرورت ہو تو وہ مجھے لکھ دے میں بھیج دوں گا - مجھے محض تفریح کے لئے بیہودہ قسم کی کہانیوں کی کتابیں بھجوانا تو پسند نہیں ہے - تم نے لکھا ہے کہ "نتاشا" کا مطالبہ تصویر کے لئے ہے - بھئی پرانا اسٹاک تو جلا چکا ہوں، نئی اب بنواؤں گا نہیں اس لئے سیدھی بات یہ ہے کہ تصویر ہم نہیں بھیجیں گے - ہمارے مذہب میں تصویر بنوانا حرام ہے - جس روز یہ بات معلوم ہوئی تھی اسی روز سارے البم نکال کر ایک ایک تصویر نکال کر چولہے میں ڈالتا چلا گیا تھا میں نے تو اپنے خیال میں اپنی تصویروں کو دنیا میں ہی آگ میں جلا کر آخرت کی آگ سے پناہ ڈھونڈ لی ہے - اب تصویر والا دور ختم ہوا - کبھی دور میں اس بات کے قائل تھے کہ تصویرِ یار دل کے آئینے میں لگی رہے تاکہ جب گردن جھکائی دیکھ لی والی بات ہو لیکن اب تو ہم دل کے آئینہ میں کسی کی تصویر بھی رکھنے کے قائل نہ رہے وہ تو خانۂ خدا ہے اسے تصویروں

سے کیسے آلودہ کیا جاسکتا ہے۔ تم نے بعض لوگوں کی طنزیہ باتوں کا ذکر کیا ہے۔ میرے نزدیک ان باتوں کی وقعت صابن کے بلبلے سے بھی کم ہے۔ ہمارے دلوں کی صفائی کا گواہ تو اللہ ہے۔ اگر اس کے نزدیک ہم سچائی پر ہیں تو دنیا کی تمام آوازیں ہمیں بُرا کہیں تب بھی ہم سچے ہیں۔ سچائی کا معیار اللہ کے نزدیک ہے۔ دنیا چاہے جو کچھ بھی کہا کرے۔ طنز کے کانٹے بکھیرنے والوں سے پھولوں کی امید نہ رکھو۔ مومن کی آزمائش ہی یہ ہے کہ وہ بُرا سنتا ہے اور بھلا کہتا ہے۔ ورنہ اگر بُرے کا جواب بُرا ہی دیا جائے تو دونوں کے کردار میں فرق کیا رہا۔ مالک تو جانتا ہے کہ زیادتی کون کر رہا ہے اور پھر وہ قادرِ مطلق ہے۔ جس کو چاہے عزت دے جسے چاہے ذلت دے۔ اس لئے اپنے معاملات کا اس کو وکیل بنا کر مقدمہ اسی کے حوالے کر دینا زیادہ بہتر ہے اور وہ بہترین وکیل ہے۔

ابا جان کی مصروفیت کا مجھے علم ہے۔ میں بھی کل ایک خط انہیں لکھ رہا ہوں۔ اسلام اور غیر اسلام کی مخلوط زندگی کو یک رنگ کرنے کے لئے جس عزم کا اظہار تم نے کیا ہے میں اس سے بے انتہا خوش ہوا ہوں۔ مجھے مسرت ہے کہ تم دین کے تقاضوں کا صحیح احساس کرنے لگی ہو۔ اللہ تعالےٰ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

نئی دہلی۔ ۲۰ مارچ ۴۶ء

---

(۱۰)

"—— تمہارا خط ملا۔ ہمیں مسلمانوں کی کسی جماعت سے دشمنی نہیں ہے۔ اس لئے کہ

مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم سب بھائی بھائی ہیں - بلکہ وہ لوگ تو ہمدردی کے مستحق ہوتے ہیں جو کسی غلط راستے پر بھٹک رہے ہوں - مسلمان مسلمان کا دشمن نہیں ہوا کرتا چاہے ان کے طرزِ عمل میں کتنا ہی بُعد کیوں نہ ہو - یہ سب ایک ہی درخت کی ٹہنیاں ہیں - کوئی ٹہنی ٹوٹ گئی ہے، کوئی لوٹ رہی ہے، کسی کو کیڑا لگ گیا ہے، کسی پہ پرندوں نے گھونسلے بنا لئے ہیں، اور کسی کے پتے جھڑ گئے ہیں، پھر بھی وہ سب ایک ہی درخت کی ٹہنیاں ہیں سب کی جڑ ایک ہی ہے ہمارا کام غصّے میں آ کر ان کرم خوردہ ٹہنیوں کو توڑنا اور کاٹنا نہیں ہے بلکہ ان کو درست کرنا اور ان کی آبیاری کرنا ہے اس لئے میں مسلمانوں کی کسی جماعت پر بھی بے دردانہ تنقید نہیں کرتا بلکہ اصلاح کی نیت سے اس کا طرزِ عمل اسلامی تعلیمات پر پرکھنے کے بعد ہی کچھ کہتا ہوں ظاہر ہے کہ اسلامی تعلیمات ہی ہماری کسوٹی ہے - جو لوگ قرآن و سنت سے الگ راہ نکالتے ہیں انہیں ٹھیک راستے کی طرف لانا ہمارا فرض ہے - اگر آج یہ سب جماعتیں قرآن و سنت کو زندگی کا اصول بنالیں تو یہ سب جماعتیں اچھی ہیں جب ہم کسی ایسے شخص سے ملتے ہیں جو ہم سے مختلف کسی خاص نقطۂ نظر کا پیرو ہو تو اسے اپنا راستہ اور نظریہ دکھانے کے لئے بہت آہستہ روی اختیار کرنی پڑتی ہے جس طرح بیمار کو ایک ایک خوراک وقت کی پابندی سے دی جاتی ہے زیادہ کھانے سے وہی دوا نقصان دے سکتی ہے - اسی طرح اپنے خیالات اور اپنے موقف کو پیش کرنے میں اور دوسرے شخص کے خیالات کی تردید اور اصلاح میں اتنی آہستہ روی اور تدریج ہونی چاہیئے کہ مخاطب بھڑک نہ جائے - بھڑک جانے کی صورت میں جماعتی عصبیت پیدا ہو جاتی ہے جس سے کسی کا راہ پر لانا اور زیادہ مشکل ہو جاتا ہے - میں نے تبلیغ میں ہمیشہ یہی طریقہ آزمایا ہے اور الحمد للہ کہ مختلف لوگ اب نماز تک باقاعدگی سے پڑھنے لگے ہیں - پہلے جہاں وہ اپنے

موقف کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہ کرتے تھے۔ اب وہ اپنی بعض غلطیوں کو مانتے ہیں میرے خیال میں اسی رفتار سے آگے بڑھنا کافی ہے۔

تمہارے لئے بھی ضروری ہے کہ تم اپنے حلقے میں یہی طریقہ اختیار کرو۔ حق بات جب سلیقہ سے کہی جائے تو بہت کم لوگ ہیں جو پوری ڈھٹائی سے اس کا انکار کر سکیں۔

چچا جان کے ہاتھ میں نے تمہارے لئے "تقویۃ الایمان" بھیجی تھی مل گئی ہوگی۔ عورتوں میں چونکہ اس زمانے میں شرک بہت بڑھ گیا ہے۔ تعویذ گنڈے قبر پرستی پیری مریدی وغیرہ اس لئے تم اس کتاب کو خود بھی غور سے پڑھو اور اپنے حلقۂ اثر میں بھی سناؤ۔ زیادہ سے زیادہ عورتوں کو اس کتاب کو پڑھنا چاہیئے۔ شرک کے متعلق اس کتاب میں بڑی تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ لکھنے والے مشہور عالم دین شاہ اسمٰعیل شہید ہیں۔ جو آج سے تقریباً سو سال پہلے اس وقت کی تحریک اسلامی کے بہت بڑے لیڈر تھے اور سکھوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ تازہ کوثر میں لوئیس فیشر کا مضمون اپنی اور پرائی برائی ضرور پڑھنا۔ انسانیت کا معیار یہی ہے کہ انسان ہر برائی سے دشمنی رکھے چاہے وہ برائی اپنی ہو یا دوسروں کی۔ لیکن عام بگاڑ کے سبب لوگوں کی یہ عادت بن گئی ہے کہ وہ اپنی برائی کو تو جان کے ساتھ لگا کر رکھتے ہیں اور اس کی حفاظت کرتے ہیں اور دوسروں کی برائیوں کو کوستے ہیں اور یہی سب برائیوں اور فسادوں کی جڑ ہے۔ میری طرف سے اپنی شیریں یاد کا ہدیہ قبول کرو۔

نئی دہلی ۲۴ مارچ ۱۹۴۶ء

۱۱

"ان دنوں ہندو مسلم فسادات زوروں پر ہیں۔ شہر میں کل ہی ایک بم پھٹا جس سے بہت سے لوگ زخمی ہو گئے دل و دماغ بہت پریشان تھے۔ آج ان زخموں پر تم نے مرہم رکھ دیا ہے اللہ تمہیں جزائے خیر دے۔ ورنہ یہ شہر تو میرے لئے جزائر انڈیمان سے کم نہیں رہ گیا ہے۔ ایسی ناراضگی بھی کاہے کی۔ خط میں تم نے دبی دبی ناراضگی اور غصے کا اظہار کیا ہے۔ تم نے لکھا ہے کہ "کسی کے پیچھے پڑ کر کوئی کام کروانا مجھے پسند نہیں ہے"۔ تمہارے ان الفاظ سے غصے کی بو آتی ہے۔ تم نے ظاہر تو نہیں کیا لیکن جان گیا ہوں۔ تم نے میری کسی بات سے ناراض ہو کر یہ الفاظ لکھے ہیں شاید تمہیں مجھے مکان ملنے میں جو تاخیر ہو رہی ہے اس کا غصہ ہے۔ حالانکہ صبر بہتر چارہ کار ہے۔ زندگی میں سب سے بڑا اصول یہ ہونا چاہیئے کہ آدمی ہر اس تلخی یا دکھ کو جسے دور کرنا اس کے بس سے باہر ہو بس اسے نظر انداز ہی کر دے ورنہ چڑ چڑا ہو کر وہ اپنا مزید نقصان کرے گا۔ بندے کو خدا کی زیادہ سے زیادہ صفات حاصل کرنی چاہیئں۔ یہ تو اللہ کی صفت ہے کہ وہ اپنے بندوں کے اندرونی اور بیرونی اچھے اور برُے اعمال کو دیکھتا ہے اور سب کو اپنی ربوبیت سے ان کا مقررہ حصہ دیتا ہی رہتا ہے جو اس کا منکر ہے اسے بھی نوازتا ہے' جو اس کی بجائے پتھر کو پوجتا ہے اسے بھی دیتا ہے' اور جو اس کے نام سے ہی نفرت کرتا ہے اسے بھی دیتا ہے۔ سب کے ساتھ اس کا سلوک درگزر اور شفقت کا ہے۔ لیکن انسان کو اگر ذرا سے تلخ حالات یا معمولی سی تلخ بات سے بھی دوچار ہونا پڑے تو اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ مخاطب سے پورا پورا بدلہ لے لے۔

اگر کسی نے دل دکھایا ہے تو اس کا بھی دل اتنا ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ ہی دکھایا جائے۔ اگر کسی نے زخم لگایا ہے تو اسے قتل ہی کر دے۔ یہ انسان کی کمزوری اور تنگدلی کی دلیل ہے وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑتا ہے جھگڑتا ہے۔ اسی کی طرف قرآن مجید میں اشارہ کیا گیا ہے کہ "انسان جھگڑالو اور ناشکرا ہے" چنانچہ انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر اپنے رب کی صفات پیدا کرے۔ کسی سے دل دُکھے تو اس کو برداشت کرے۔ اور جوابی طور پر اس کا دل نہ دکھائے۔ کسی سے زخم لگے تو اسے برداشت کرے اور اس کے زخموں پر مرہم رکھ دے۔ اب میرے کسی لفظ پر تمہیں الجھن ہوئی جو لفظ ممکن ہے میں نے کن معنوں میں استعمال کیا ہو یا ممکن ہے بے خیالی میں لکھ دیا ہو۔ لیکن تم نے غصہ کیا۔ بُرا منایا اور مجھے غصے سے بھرا ہوا ایک خط بھی لکھ ڈالا اور میں نے کیا جواب دیا وہ میرے خطوط سے ظاہر ہو گیا ہوگا۔ خدا کے لئے اپنے دل کو کچھ مزید بڑا کرو۔ بہت بڑا جس میں چھوٹی چھوٹی باتیں فنا ہو جائیں۔ خدائے عظیم کی عظیم محبت کے لئے چھوٹے دل کام نہیں دیتے۔ اس راہ میں بڑے دلوں کی ضرورت ہے جو دشمنوں کو بخش سکیں جو مخالفوں کو بھی دکھ دینا پسند نہ کریں۔ اپنوں کی طرف سے تو غم کھا لیا جاتا ہے اور غصہ پی لیا جاتا ہے۔ اصل مردانگی تو دشمنوں اور مخالفوں کی دشمنی اور مخالفت پر صبر ہے۔ اس کے لئے تو صحابہ کرامؓ جیسا جگر چاہیئے اور جس کسی نے صحابہ کرامؓ کے نقشِ قدم پر چل کر ان کے کئے ہوئے کام کو اس دور میں زندہ کرنا ہو اسے ان کا سا جگر بنانا ہی پڑے گا۔ جانِ من غصہ کو غصہ نہیں کاٹتا۔ غصے کو شفقت اور محبت کاٹتی ہے۔

نئی دہلی ۔ ۲۷ مارچ ۴۶ء

۱۲

—— تم نے آج کل کے مسلمانوں کا دردناک انداز میں ذکر کیا ہے۔ ان کی موجودہ حالت پر دکھ محسوس کیا ہے یہ بالکل فطری بات ہے ان کی رسوائی ہماری رسوائی ہے۔ وہ ہمارا گوشت پوست ہیں۔ مشکل بات یہ ہے کہ آج کے مسلمان بھی دوسری بہت سی قوموں میں سے ایک قوم بن کر رہ گئے ہیں جنھوں نے اسلام کا صحیح اور سیدھا راستہ مکمل طور پر اختیار کرنے کی بجائے نفس پرستی کے ٹیڑھے راستے اختیار کر لئے ہیں چنانچہ کبھی وہ ہندوؤں کی تقلید کرتے ہیں اور کبھی انگریزوں کی اور دونوں طرف جا کر خوش ہوتے ہیں اور فخر کرتے ہیں۔ ایسے مسلمان اسلام کے لئے مردہ سرمایہ (DEAD CAPITAL) بن گئے ہیں جن کا وجود اسلام کی سربلندی کے لئے نہ ہونے کے برابر ہے بلکہ الٹا اسلام کی رسوائی کا باعث بن رہا ہے۔ جب تک مسلمان اسلام کا زندہ اور کھرا سرمایہ نہ بنیں۔ ان کے ساتھ اسلام کی بھی رسوائی ہوتی ہے۔ افسوس کہ نظریاتی گروہ آج نسلی قوم بن کر رہ گیا ہے۔

کل اجتماع میں جا رہا ہوں رات ۱۰ بجے گاڑی جاتی ہے ۶ دن کی رخصت لی ہے ۸ اپریل کو واپس پہنچ جاؤں گا انشاء اللہ۔ تم یوں جواب دینا کہ مجھے ۸ اپریل کو دفتر میں مل جائے۔

ان دنوں مستعدی سے مطالعہ کئے جاؤ۔ اللہ کے راستے پر مضبوط ہو کر چلنے کی کوشش کرو اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

نئی دہلی۔ یکم اپریل ۶۶ء

۱۳

۔۔۔اجتماع سے واپس آگیا ہوں ۔ اجتماع کے حالات تفصیل سے پھر کسی وقت لکھوں گا۔ بس اتنا ہی کافی ہے کہ اسلامی زندگی کی صحیح روح اور ایمانی جذبے کا صحیح مظاہرہ وہاں دیکھ کر آیا ہوں ۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ملک بھر سے قوم کا مکھن چھانٹ کر جمع کر لیا گیا ہے اجتماع میں تقریباً ڈیڑھ دو ہزار آدمی تھے جو ملک کے گوشے گوشے سے کھنچ کر آئے تھے۔ ہر صوبے کا شخص، لیکن سب میں ایک ہی انسانیت ایک ہی ہمدردی ایک ہی دل و دماغ، اور ایک ہی اصول نظر آتا تھا۔ وہاں یہ صحیح طور پر معلوم ہو رہا تھا کہ یہی وہ لوگ ہیں جن کا خدا بھی ایک ہے اور رسولؐ بھی ایک ۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ ایسا اسلامی گروہ جن کے یہ اصول ہوں وہ اگر ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی مخلصانہ کوشش کرے اور اسکی صحیح رہنمائی ہو تو یہ دنیا میں ضرور کامیاب ہو سکتا ہے ۔ اصل مسئلہ اصولوں پر عمل پیرا ہونے کا ہے ورنہ کتابوں میں تو بہت عمدہ اصول درج ہیں ۔ البتہ نیت کے اعتبار سے تو یہ اسی دن سے کامیاب ہو چکے جس دن انہوں نے اللہ کے نام کو بلند کرنے کا عہد کیا ۔ ان کی حقیقی کامیابی انہیں مل چکی ۔ ظاہری مادی کامیابی درحقیقت وہ مرتبہ نہیں رکھتی جو خدا کے آگے سرخروئی کی کامیابی درجہ رکھتی ہے ۔ اس لئے ہر وہ شخص جو خدا کی راہ پر چل پڑا وہ اپنی نیت کے مطابق اسی وقت کامیاب ہو چکا ۔ جیسے ایک شخص حج کے لئے جاتا ہے تو جب وہ نیتِ حج کر کے گھر سے نکل پڑا تو چاہے وہ کعبہ شریف پہنچ کر حج مکمل کر لے یا راہ میں ہی فوت ہو جائے اس کا حج بہر حال ہو گیا۔ اللہ کے راستے کا یہی اصول

کامیابی ہے۔

تم خطبات اور رسالہ دینیات کو خوب دل لگا کر پڑھ لو اور "تقویۃ الایمان" کو بھی دیکھ لو۔ حضرت امام حسینؓ کے بارے میں لکھی گئی شہید اعظم نامی کتاب میں تم دیکھو گی کہ ہم جن کی اولاد ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں انہوں نے کتنی کمزور مادی حالت کے باوجود حق کے لئے کتنی بڑی سلطنت کا مقابلہ کیا۔ حق کی حمایت میں لڑنے کے معنی لازماً یہی نہیں ہوتے کہ آدمی جیت ہی جائے لیکن ہار کر بھی وہ اللہ کے نزدیک تو سرخرو ہو جاتا ہے۔ یہی اسوۂ حسینی ہمارے لئے مشعلِ راہ ہونا چاہیئے امام حسینؓ نے تو لایکلف اللہ نفساً الا وسعہا کا کوئی خود ساختہ سہارا تلاش نہیں کیا تھا۔ جب حق کے اعلان کا موقعہ آیا تو وہ خم ٹھونک کر میدان میں آ گئے۔ جو لوگ لایکلف اللہ کے سائے میں پناہ ڈھونڈتے ہیں ان سے پوچھنا چاہیئے کہ انہیں اس کی اطلاع کس نے دی ہے کہ فلاں کام کے وہ اس لئے مکلف نہیں ہیں کہ وہ ان کے بس سے باہر ہے۔ اگر استطاعت کا یہی مفہوم ہے اور دینِ اسلام کا قیام مسلمانوں کے بس سے باہر ہے تو پھر اللہ کو کیا ضرورت تھی کہ اسلام کو پوری انسانیت کا دین بنا کر قیامت تک کے لئے اس کو پوری انسانیت کی فلاح کا ذریعہ بنا دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ خالق کی طرف سے آیا ہے وہ سب کچھ مخلوق کے احاطۂ برداشت میں ہوتا ہے۔ ویسے تو مسلمانوں کو اب صرف میٹھا کھانے کی سنت ہی یاد رہ گئی ہے اور بدر و احد کے معرکوں میں سر کٹانے کی سنت وہ بھول گئے ہیں۔

آج مسلمان اپنے دل و دماغ کو چھوٹے چھوٹے مسائل میں الجھا کر اقامتِ دین کے بڑے کام سے جی چراتے ہیں اور تاویل کے بہانے بنا بنا کر اپنے لئے فرار کی راہیں

نکالتے ہیں ۔ کہیں اکرام مُسلم اور توہینِ صحابہ کا جھگڑا ہے ۔ کہیں خلافت کے جھگڑے ہیں کہیں حضرت مسیح کی زندگی اور موت کے افسانے ہیں ۔ کہیں رفع یدین کا مسئلہ ہے ۔ کہیں حلال و حرام کا تنازع ہے اور کہیں وراثت کے فساد ہیں ۔ ان سب ڈھالوں کے پیچھے وہ اپنے ضمیروں کو حق کی راہ کی قربانیوں سے بچانے کے لئے چھپاتے ہیں ۔ لیکن اگر وہ انسانوں سے اپنے آپ کو چھپاتے ہیں تو کیا اللہ پاک بھی ان کی ان بزدلیوں اور نیتوں سے ناواقف ہے ؟ وہ تو خوب جانتا ہے کہ یہ لوگ دھوکا دے رہے ہیں ۔ لیکن دھوکا دینے والا شخص سب سے زیادہ اپنی ذات کو ہی دھوکا دیتا ہے ۔

نئی دہلی ۔ ۸ اپریل ۱۹۴۶ء

۱۴

آج صبح ہی ایک خط لکھا ہے ۔ دفتر پہنچتے ہی تمہارا خط ملا ۔ سفر کی چند دن کی تکان سب رفع ہو گئی ۔ ان لوگوں کو خوش قسمت کہا جاتا ہے جن کی زندگی میں ہمارے جیسی شیرینی ہو ۔ یہ لذت آمیز انتظار اور یہ محبت انگیز جدائی بھی عجیب نعمت ہے ۔ فراق میں زندگی آموز سوز اور راحت آمیز دکھ ہوتا ہے جس سے قلبی کیفیات میں اضافہ ہوتا ہے اسی لئے تو علامہؒ نے فراق کو وصل پر ترجیح دی ہے ۔

ے عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذّتِ طلب

سلمیٰ آپا نے بھائی جان پر کنجوسی کا فتویٰ لگایا ہے شاید اس لئے کہ میں نے انہیں ابھی تک "جوتے" کا نذرانہ ادا نہیں کیا۔ میں سوچتا ہوں حاتم کو اس کی قبر میں شرمندہ کرنے سے کیا حاصل ہے۔ مرنے والوں کا احترام کرنا چاہیئے۔

بے ڈھنگے لوگوں نے تمہیں "شوہر پرست" کہنا شروع کر دیا ہے خوب! قدیم زمانے میں تو عورتیں اس خطاب کے لئے بیسیوں جتن کرتی تھیں اور اسے اپنی گھریلو زندگی میں کامیابی کا سب سے بڑا اعزاز سمجھتی تھیں۔ لیکن "یہ پرستش" والی بات غلط ہے۔ تم نے بالکل صحیح جواب دیا کہ پرستش تو صرف اللہ تعالےٰ کے لئے ہی ہے، یہ ایک مومن کا سچا جواب ہے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ تم زندگی کے تمام معاملات کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنے لگی ہو جو ایک مسلمان کا صحیح نقطۂ نظر ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ ہر قسم کی پرستشیں صرف اللہ ہی کے لئے خاص ہیں۔ وہی معبودِ حقیقی ہے۔ اسی کی اطاعت اول ہے۔ اسی کی اطاعت پر ہمارا سارا سامانِ عاقبت تیار ہوتا ہے۔ جو اطاعت اس کی اطاعت کے ماتحت ہے بس وہی ٹھیک اور درست ہے جو اس کی اطاعت سے ہٹ کر اطاعت کی جائے تو پھر وہ اطاعت کفر ہے۔ ماں باپ کی اطاعت، شوہر کی اطاعت، بزرگوں کی اطاعت، غرض زندگی کی ساری اطاعتیں اگر اللہ کی اطاعت اور مرضی کے ماتحت ہیں تو درست ہیں ورنہ سب غلط ہیں۔ اس صورت میں بیوی کی محبت یا شوہر کی محبت یا والدین اور بہن بھائیوں کی محبت اگر اللہ کی محبت اور مرضی کے ماتحت ہیں تو درست ہیں ورنہ سب غلط ہیں۔ اللہ کی مرضی اور اطاعت ہی سب سے بڑا

معیار ہے۔ میری محبت بھی اگر اللہ کی محبت اور اطاعت کے تحت ہو تو درست ہے ورنہ محض نفس پرستی ہے۔ اگر میں بھی کوئی غلط بات اللہ کے احکام سے ہٹ کر تمہیں کہوں تو میری اس بات کی اطاعت بھی تم پر ہرگز ہرگز لازم نہیں ہے۔ بلکہ تمہارا فرض ہے کہ اگر میں سیدھی راہِ خدا سے بھٹکوں تو تم مجھے اس سے آگاہ کرو اور مجھے سیدھا کرنے کی کوشش کرو۔ آخرت میں اپنے اعمال کے جواب دِہ ہم دونوں ہوں گے اور دونوں ہی ایک دوسرے کے اعمال کے ذمہ دار بھی قرار پائیں گے۔ تمہاری خامیوں پر مجھ سے بھی باز پرس ہو گی اور میری خامیوں پر تم سے بھی جواب طلب کیا جائے گا۔ ہمیں زندگی کا ہر فعل اس خیال سے انجام دینا چاہئے کہ ہم سے کل اس کا جواب پوچھا جائے گا جس کام یا بات یا حرکت کے لئے تمہارا دل اور ضمیر تمہیں اطمینان بخش جواب نہ دے سکے تمہیں وہ نہ کرنا چاہیئے۔ یہ دنیا تو ایک کمرۂ امتحان ہے یہاں تو کسی سے باز پرس نہیں ہوتی۔ اگر امتحان دینے والا امتحان کا وقت یونہی بے کار بیٹھ کر گزار دے تو بھی اسے کوئی نہ پوچھے گا۔ اور اگر محنت سے پرچہ حل کرنے میں صرف کرے تب بھی کوئی نہ روکے گا۔ البتہ جب نتیجہ نکلے گا تو امتحان گاہ میں تین گھنٹے بیٹھنے اور کچھ نہ کرنے والے کو یوں تین گھنٹے ضائع کرنے کی سزا ایک سال برباد کرنے کی صورت میں دی جائے گی تو بتاؤ جس نے دنیا کی امتحان گاہ میں اپنی زندگی کے اتنے طویل سال اللہ کی مرضی سے الگ رہ کر یوں ہی گزار دیئے ہوں اور ہمیشہ اللہ کی مرضی سے بے نیاز رہا ہو۔ اور اللہ کی راہ میں تکلیفیں سہہ کر اور محنت کر کے اس کی رضا طلب نہ کی ہو اس کو اپنی زندگی کی طویل مدت فضول گزار دینے کی کتنی لمبی سزا ملنی چاہیئے اس کا اندازہ تم خود کر سکتی ہو ——— مجھے بے انتہا مسرت ہے کہ تم نے ایک سچے مومن کے زاویہ نظر سے سوچنا شروع کر دیا ہے۔ تم ان کتابوں کا جو میں

نے بھجوائی تھیں غور و فکر سے مطالعہ کرتی جاؤ۔ اور دیکھو کہ اللہ اپنے بندوں کو کس قسم کی اطاعت کا حکم دیتا ہے اللہ سے نماز کے بعد دعا کیا کرو کہ وہ ہمیں نیکی کی توفیق دے۔ رزق حلال دے چاہے وہ کم ہی ہو۔ اپنی راہ میں بڑی سے بڑی قربانی دینے کی ہمت دے اور ہماری زندگیوں کو اپنے پاک مقصد کی پاک راہ میں وقف کرنے کی توفیق دے۔ اس چند روزہ دنیا سے کہیں زیادہ ضروری وہ مستقل دوسری دنیا ہے جو آخرت کہلاتی ہے اور جو ہماری اصل زندگی ہے اگر ہم ایک ہی راستے پر چلتے رہے تو یہ خیال میرے لئے بڑا دل خوش کن ہے کہ ہمیں دنیا اور آخرت میں باہمی رفاقت حاصل ہو گی۔

اگر اب تم پر کوئی ایسا اعتراض کرے تو تم اسے "ادب" اور "پرستش" کا فرق اچھی طرح سمجھا دو۔ مسلمان تو صرف ایک خدا کی پرستش کرتا ہے۔ اور ادب وہ ہر اس شخص کا کرتا ہے جس کا ادب کرنے کا اسے حکم دیا گیا ہے۔ یہ مسلمانی کی ابتدا ہے جو شخص اس ابتدا ہی کو بھلا دے اس کو تو اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیئے۔

ہمارے شہر میں آج مسلم لیگ کا سالانہ اجتماع ہو رہا ہے جس میں سارے ہندوستان سے مسلمان لیڈر جمع ہو رہے ہیں مجھے بھی اس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا ہے۔ فرصت ملی تو ضرور جاؤں گا اللہ کرے مسلم لیگ پاکستان کی جدوجہد میں کامیاب رہے لیکن مجھے خدشہ ہے کہ یہ لوگ پاکستان میں اسلامی نظام قائم نہیں کر سکیں گے۔ ان میں یہ صلاحیت مجھے تو نظر نہیں آتی۔ اصل چیز تو کردار ہے۔ حضورؐ نے پہلے کردار بنائے تھے پھر اسلامی نظام قائم کیا تھا۔ بہر حال ہماری دعا تو یہی ہے کہ دنیا ایک بار پھر اسلامی نظام کا نقشہ دیکھ سکے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر تو دنیا اسلام قبول کرنے سے رہی۔ بہر حال اللہ تعالیٰ سے بہت سی خوش آئند امیدیں دابستہ ہیں

نئی دہلی — ۸۔ اپریل ۴۶ء

۱۵

۔۔۔ابھی ابھی تمہارا خط ملا ہے۔ خط میں تم کچھ اکتائی اکتائی سی نظر آتی ہو۔ حالات کے اس ٹھہراؤ پر تم پریشان ہو۔ انتظار کرو مزید انتظار کرو۔ اس کا کیا علاج کہ والدین کی مصلحتیں کچھ ایسی ہی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ یہ بزرگ لوگ بہت سے رسم و رواج قائم بھی رکھنا چاہتے ہیں اور توڑنا بھی چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ توڑنے کی ہمت نہیں اور قائم رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ میرا خیال اس معاملے میں سیدھا اور صاف ہے۔ جو رواج اللہ کی شریعت کے مطابق نہ ہو اسے توڑ دیا جائے اور اس کے ٹوٹنے پر اگر کوئی ناراض ہو تو اس کی پرواہ نہ کی جائے آخر کسی کی عزت رسولؐ پاک کی عزت سے زیادہ تو نہیں ہو سکتی اور نہ کسی لڑکی کی وقعت حضورؐ پاک کی صاحبزادی سے زیادہ ہو سکتی ہے۔ بس ہمارے لئے تو ان کا نمونہ ہی کافی ہے۔ بہرحال اب مزید انتظار کرو۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہی ہے جو ہمارے سارے کام درست کرنے والا ہے۔ کس میں آخر اتنی ہمت ہے کہ اس کی مرضی کے خلاف اس کی کائنات میں رہتے ہوئے اس سے اپنا کوئی کام زبردستی کروا سکے۔ بس ہماری تو ہر خواہش اور ہر آرزو اللہ ہی کے حضور میں حاضر ہے وہاں سے جو منظوری ملے گی ٹھیک ہے۔

تم نے عربی سیکھنے کا شوق ظاہر کیا ہے اور اس کمی کو شدت سے محسوس کیا ہے یہی حال میرا بھی ہے۔ میں تو ایک چھوٹی سی کتاب "عربی کا معلم" خرید بھی لایا ہوں۔ کہو تو تمہیں بھی بھیج دوں۔ اس سے عربی کی معمولی سی سوجھ بوجھ پیدا ہو جاتی ہے مزید کوشش کرنے سے مزید آ جائے گی۔ اس نقطۂ نظر سے اس زبان کا جاننا تو ہمارے لئے بہت ہی

ضروری ہے۔ یہ ہمارے دین کی ترجمان اور ہمارے قرآن کی زبان ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے آخری نبیؐ اور آخری پیغام کے لئے اسی زبان کو منتخب کیا ہے۔

خطوط پر پتہ اب تم نے انگریزی میں لکھنا شروع کر دیا ہے۔ ویسے تو مجھے اردو پتے کے خطوط بھی مل جاتے ہیں۔ اب پریشانی دور کرو اور اللہ پر تکیہ کر کے اپنا کام کئے جاؤ۔

تمہیں شاید معلوم نہیں کہ آج ۱۰ اپریل کا دن میرا سالگرہ کا دن ہے۔

نئی دہلی۔ ۱۰ اپریل ۱۹۴۶ء

---

(۱۶)

آج تمہارا خط دفتر میں ملا۔ شکریہ۔ تم نے دل کو سکون دینے والی بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں اپنے انداز میں لکھی ہیں تمہارے خیالات سے اطمینان ہوتا ہے۔ مسلمان کیلئے اللہ کا بندہ ہونے کی حیثیت سے دنیا میں بڑی جدوجہد اور مشقت کی زندگی ہے۔ جس میں ہر نوعیت کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ پھر اس قربانی کے تناسب سے ہی آخرت میں اس کے لئے سرخروئی ہے۔ یہ ایک کٹھن کام ہے۔ بوجھل ہے۔ سوچ سمجھ کر اٹھانے کا کام ہے۔ پہاڑ کمر پر لاد کر سفر کرنے والی بات ہے۔ اس سخت مشقت میں مجھے تمہاری رفاقت کی اشد ضرورت ہے۔ دکھ سکھ کے ساتھی کی حیثیت سے سکون پہنچانے والی بیوی اور حوصلہ دلانے والی رفیقہ کی حیثیت سے۔ اس تکلیف دہ حد تک بگڑی ہوئی دنیا میں اللہ کے دین کو قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ تو اتنی خوفناک ذمہ داری

ہے کہ اس کی ہیبت ایٹم بم سے بھی بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ موجودہ دور میں کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا۔ کہ باطل نظام کو ختم کرنے کے لئے ان طاغوتی طاقتوں کے خلاف بے سروسامانی کی حالت میں کوئی آواز اٹھائی جاسکے لیکن بس اللہ کے وعدے پر ایمان ہے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے سچے اطاعت گزاروں پر نظرِ کرم رکھتا ہے۔ اس نے وعدہ فرمایا ہے کہ اس کی راہ میں لڑنے اور مصیبت اٹھانے والا اسی وقت سے کامیاب ہوجاتا ہے جب وہ اس کا ارادہ کرلیتا ہے۔

تم خط سے جلد جلد نوازتی رہو تمہارے خط میرے لئے محبت کی خوشبو لاتے ہیں۔ یہ چند روزہ زندگی اگر ہم نے عیش میں گزار دی تو کیا۔ بہرحال یہ وقت تو گزر ہی جاتا ہے۔ پھر یونہی ایک دن آئے گا کہ عمر کا ایک طویل بوجھ ہماری پیٹھ پر لدا ہوا ہوگا۔ یہ دنیا تو پلک جھپکنے میں گزر جاتی ہے۔ اس لئے ہمیں اُس زندگی کا سامان زیادہ مستحکم کرنا چاہیئے۔ جس زندگی میں ہمیں ہمیشہ جاکر رہنا ہے۔ اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارا قدم میرے ساتھ اٹھنے کے لئے تیار ہے۔ میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔ اس سلسلے میں مَیں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں اور تمہاری وجہ سے اپنے آپ کو بھی مبارکباد کے قابل سمجھتا ہوں۔

نئی دہلی۔ ۱۶/ اپریل ۴۶ء

۱۷

— آج اتوار تھا صبح سے دل چاہ رہا تھا کہ تمہیں خط لکھوں - بار بار تمہاری یاد آرہی تھی لیکن کچھ احباب کی موجودگی اور کچھ ملنے والوں کی آمدورفت میں دن یونہی گزر گیا۔ اب رات کی تنہائی میں تم سے باتیں کرنے کا وقت نکلا ہے - یوں بھی دل کی باتوں کے لئے، وہ جس سے بھی کی جائیں۔ رات کا وقت زیادہ موزوں ہوتا ہے۔

تمہارے خط سے اندازہ ہوا کہ میری طرح تم بھی بے چین ہو۔ تمہاری یاد مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے اور حالات روکتے ہیں۔ لیکن وقت اور حالات کو کیا معلوم کہ جس زخم کا پھاہا ان کے پاس ہوتا ہے۔ یہ وہ زخم نہیں ہے۔

آج دن میں دو تین رسائل کے مدیرانِ کرام تشریف لائے۔ وہ مجھے شہر میں بلاتے ہیں لیکن میرے پاس شہر میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ ایک صاحب تو اپنے ساتھ ہی رہنے کیلئے مجبور کر رہے ہیں۔ میری اپنی مصلحتیں بھی یہی ہیں کہ شہر میں جا رہوں۔ شہر میں رہنے سے میرے آئندہ کے پروگراموں میں روح پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ تو کھلی چیز ہے کہ مجھے انگریز کے اس طاغوتی نظام کی ملازمت نہیں کرنی ہے۔ محض موزوں وقت موقعہ اور یکسوئی کا انتظار ہے۔ اور اس سے پہلے کہ اللہ پاک مجھے موجودہ حرام سالم روٹی سے بچا کر چاہے مجھے حلال آدھی روٹی ہی دے مجھے اس کے لئے پہلے سے تیاری بھی کرنی ہے۔ ایڈیٹر حضرات مجھ سے میرے افسانے خریدنا چاہتے ہیں۔ لیکن میں اب محسوس کرنے لگا ہوں کہ موجودہ طرز کے افسانے لکھنا اور خرافات بکنا ایک برابر ہے۔ اسی لئے جب سے میں نے پورا مسلمان بن جانے کا پختہ عہد کیا ہے اب کچھ دنوں سے ترقی پسندی پر مبنی

انسانے لکھنے کی اس خرافات کو بھی ترک کر دیا ہے۔ لیکن میرے پاس پہلے سے جو کچھ لکھا ہوا اٹاک پڑا ہے اسے یہ حضرات خریدنا چاہتے ہیں۔ لیکن اب طبیعت اس طرف نہیں آتی۔ جو افسانے میں نے اپنے زمانۂ بے شعوری میں لکھ ڈالے ہیں ان سب کو جلا دینا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ حضرات روپے کا لالچ دے کر مجھے لکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہمیں خدا کے سامنے اپنے کانوں آنکھوں ہاتھ پاؤں دل و دماغ غرضیکہ ہر قوت کا حساب دینا ہوگا۔ ہر ہر قوت جو اللہ پاک نے انسان کو دی ہے اس کا پورا پورا حساب خدا کے ہاں جا کر دینا پڑے گا۔ اگر اس امانت کو ہم دنیا میں غلط استعمال کرتے رہے ہیں تو نتیجہ ظاہر ہے کہ سخت بازپرس ہوگی اور اللہ تعالیٰ ناراض ہوگا۔ یہی معاملہ اس قلم کی قوت کا بھی ہے۔ اب اس دنیا میں اگر میں اس قوت کو بے مقصد استعمال کرتا ہوں تو آخر وہاں میں کیا جواب دوں گا۔ پھر تو یہی لکھا ہوا ایک ایک لفظ میرے لئے وہاں عذاب کا وزن بڑھاتا رہے گا بس اُس دن سے ڈرتا ہوں۔ اسی لئے میں نے اب وہ خرافات نگاری ترک کر دی ہے لیکن یہ میرے پرانے گاہک مدیرانِ کرام جان نہیں چھوڑتے۔ بہرحال آہستہ آہستہ سمجھ جائیں گے کہ اس شخص کو کیا ہو گیا ہے۔ تم دعا کرو کہ اللہ پاک اپنی راہ سے ہٹ کر لکھی ہوئی ان تحریروں کی بازپرس سے صرف نظر فرمائے۔ اب آئندہ ایسا لکھنے سے توبہ کر لی ہے اور اپنے اندر نئے طرز میں لکھنے کی صلاحیت بالکل مفقود پاتا ہوں۔ دل و دماغ کے درمیان ادب کا ایک رواں دواں چشمہ تھا جسے میں نے اب خود بند کر دیا ہے اس لئے کہ اس کا پانی گدلا ہو گیا تھا۔ نیا چشمہ کب پھوٹتا ہے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ان دنوں مدیرانِ کرام کے کتنے ہی رسالے اور رسالنامے آ کر میرے سامنے پڑے ہیں۔ جن کو میں نے چھو کر بھی نہیں دیکھا ہے اگر تم ہوتیں تو ان سے چائے خوب گرم کر سکتی تھیں۔ تم میرے ترک ملازمت سے کچھ کچھ خفا اور پریشان ہو۔ غم نہ کرو رازق اللہ ہے۔ اس نے فرمایا ہے کہ اگر مجھے مسلمانوں کی دل شکنی کا خیال

نہ ہوتا تو میں کافروں کو اس دنیا میں سونے کے مکان اور چاندی کی سیڑھیاں دیتا۔ اس لئے کہ "بیچارے" کافر کا حصہ تو یہی دنیا ہے جس کی ساری پونجی دنیا کے یہی چار دن ہیں۔ اسی میں اس نے سب کچھ لینا اور دیکھنا ہے اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے لیکن مسلمان جو اللہ کی اطاعت اور محبت پر اپنی زندگی کی بنیاد رکھتا ہے" اس کے لئے اس دنیا کی دولت لازمی نہیں ہے اس لئے کہ اس کا بڑا اور ہمیشہ کا حصہ تو آخرت میں رکھا ہے جو اس کی دنیا کی عمدہ کارگزاری کا انعام ہے۔ تم دعوے کرو کہ میں آپ کی تابعدار اطاعت گزار اور وفادار ہوں تو ظاہر ہے کہ میں چاہوں گا کہ تمہاری اس محبت وفا اور اطاعت کے دعوے کو کبھی نہ کبھی ضرور آزما کر بھی دیکھوں۔ یہی حال ہر دعوے کرنے والے کا ہوتا ہے۔ جو کوئی جیسا دعوےٰ کرتا ہے اسے اپنے دعوے کا ثبوت بھی پیش کرنا پڑتا ہے۔ ایک شخص نے حضورؐ سے عرض کیا "میں آپ سے محبت کرتا ہوں حضورؐ نے فرمایا دیکھ کیا کہتا ہے۔ جو شخص میری محبت کا دعوے کرے اسے فقر و فاقہ کے لیے تیار رہنا چاہیئے اس کی طرف فقر و فاقہ اس طرح آتا ہے جیسے ڈھلوان کی طرف سیلاب آتا ہے۔" چنانچہ جب ہم اللہ کی اطاعت کا اور زندگی میں اس کی محبت کا دعوے کرتے ہیں تو پھر اللہ بھی ہمیں جان و مال کے نقصان اور ان کی قربانی سے آزماتا ہے۔ محبت کو پرکھتا ہے اطاعت کو جانچتا ہے۔ ہمارے دلوں کو حالات کے شکنجے میں کس کران کے حوصلے دیکھتا ہے۔ یہ تو اصول پختہ ہے کہ ہر شخص کا دعوے آزمایا جائے گا۔ جب کوئی شخص خدا و رسولؐ کی محبت اور اطاعت کا دعوے کر بیٹھے تو اسے ضرور آزمایا جائے گا اور جب آزمائش آجائے تو پھر اس میں سے بڑی ذمہ داری صبر اور احتیاط سے گزرنا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہی وقت ہوتا ہے جب اسے اپنی اطاعت اور محبت کا ثبوت بہم پہنچانا ہوتا ہے تو ——— جانِ عزیز ——— ہم بھی مالک کی اطاعت اور محبت کا دعوے کرتے ہیں۔

لاالہ الااللہ کہہ کر اس کی حقیقی بادشاہت کا اعلان کرتے ہیں اور دوسرے سب بادشاہی اور خدائی کا دعوے کرنے والوں کو جھوٹا اور کذاب قرار دیتے ہیں تو ہمیں بھی مکمل طور پر تیار رہنا چاہیے کہ ہمارا یہ دعوے کسوٹی پر چڑھایا اور پرکھا جائے گا۔ جو شخص یہ دعوے کر کے بد بختی سے فیل ہو گیا، وہ یہاں اور آخرت دونوں جگہ ذلیل ہو گا اور جو توفیق الٰہی سے پاس ہو گیا اور اس نے اپنے محبوب کی طرف سے آئے ہوئے سارے دکھ، سارے غم، ساری بھوکیں یہ کہہ کر سینے سے لگالیں کہ یہ میرے محبوب کی میرے اللہ کی بھیجی ہوئی آزمائشیں ہیں تو اس نے میدان جیت لیا —— ہم نے —— میں نے اور تم نے —— اس میدان میں ابھی بنا نیا قدم رکھا ہے۔ جہاں سے ہمارے دعوے کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہم نے طوطے کی طرح نہیں بلکہ خوب سوچ سمجھ کر، اور اس کی بھاری ذمہ داریوں کو محسوس کر کے از سر نو اللہ کی توحید اور محمدؐ رسول اللہ کی رسالت کا اقرار کیا ہے۔ اس طرح ہم نے اللہ کے سوا سب دوسری اطاعتوں کا انکار کر دیا ہے اور محمدؐ رسول اللہ کو اپنی زندگی کا ہادی مان لیا ہے اب ان کی ہدایت اور اطاعت سے ہٹ کر ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اب ہماری ساری اطاعتیں اللہ کے لئے وقف ہو گئی ہیں اور ساری کوششیں رسول اکرمؐ کی پیروی میں ہی صرف ہونے کے لئے ہیں۔ اب جو شخص بھی ان کے احکام سے ہٹ کر ہم سے بات کرے ہم اس سے مصالحت کی بات نہیں کر سکتے۔ ہماری نظر میں نہ روپیہ قیمت رکھتا ہے نہ حسن نہ دولت نہ بادشاہی اور نہ زمین۔ رسول پاکؐ کی مقدس انقلابی زندگی کا وہ واقعہ ہمارے سارے سے جب کفار نے رسول پاک کی دعوت سے تنگ آکر اور ان کی تبلیغ سے پریشان ہو کر ان کے سامنے پیشکش کی تھی۔

"اے محمدؐ کیا تمہیں بادشاہی کی ضرورت ہے؟ بخدا اگر تو بادشاہی چاہتا ہے تو ہم سب تیری بادشاہی ماننے کے لئے تیار ہیں۔ کیا تو کسی خوبصورت عورت سے شادی کرنا

چاہتا ہے ؟ ہم عرب کی حسین ترین عورت تیرے قدموں میں لا سکتے ہیں، کیا تو دولت چاہتا ہے تو ہم سارے عرب کی دولت تیرے قدموں میں ڈھیر کر سکتے ہیں بشرطیکہ تم اپنی تبلیغ چھوڑ دو۔"

ذرا سوچو کون ہے دنیا کا انسان جو ایسی ترغیبات پر پھسل نہ جائے" دنیا کا سارا کچھ حضور کے سامنے لا کر ڈال دیا گیا تھا لیکن ایک مومن جو صرف اللہ کا مطیع ہے وہ ان سب چیزوں سے نظر بلند رکھتا ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ سچائی کے راستے کے یہ سب کانٹے ہیں اور ان کانٹوں پر پاؤں رکھے بغیر کوئی اپنی منزل مقصود پر پہنچ نہیں سکتا۔ حضورؐ نے جواب دیا۔ "بخدا اگر تم میرے بائیں ہاتھ میں چاند اور دائیں میں سورج بھی لا کر رکھ دو تو میں اس دعوت سے باز نہ آؤں گا"۔ حضورؐ کا یہ جواب ہر مسلمان کے لئے ایک کسوٹی پیش کرتا ہے۔ مسلمان کے سامنے ہر زمانے میں یہ تینوں پھندے موجود ہیں اور جو شخص جب بھی ان میں سے جس میں پھنس گیا وہ یقیناً اپنے نصب العین سے بھٹک گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں مغل لودھی پٹھان خلجی اور سوری سب مسلمان بادشاہ تھے۔ لیکن ان تینوں چیزوں میں الجھ کر وہ حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کو بھول گئے۔ آج جس ملک میں مسلمانوں نے ہزار سال تک حکومت کی تھی اس ملک میں وہ اپنی ہی قدیم غلام قوم سے خوف زدہ ہیں۔ وہ دس کروڑ کی تعداد میں ہوتے ہوئے بھی کفار سے ہراساں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر آج بھی مسلمانوں میں وہ ایمان اور روح پیدا ہو جائے جو ان کی صحیح شناخت ہے تو دس کروڑ تو بڑی تعداد ہے دس لاکھ بھی دنیا کی موجودہ بساط الٹنے اور دنیا کی از سرِ نو تعمیر کرنے کے لئے کافی ہیں مجھے یقین ہے کہ اللہ پاک مسلمانوں میں ایسے لوگ ضرور پیدا کرے گا کاش کہ ان میں ہم بھی شامل ہوں۔ دعا کرو جانِ من۔ دعا کرو اور ضرور کرو۔

کوشش کرو کہ ہماری زندگی تمام تکلفات اور تصنعات سے پاک سادہ سی زندگی ہو۔

کوئی رسم کوئی رواج ہم میں گھسنے نہ پائے۔ یہ تصنعات ہماری کمزوریوں کی جڑیں ہیں ان کو پہلے اکھاڑ کر پھینکنا پڑے گا۔ ہماری تو زندگی کا معیار بھی یہ ہونا چاہیئے کہ جو اللہ کے راستے میں چلنے میں ہمارا ساتھ دے چاہے وہ دشمن رہا ہو بس وہی ہمارا دوست ہے۔ اور جو اللہ کے راستے میں چلنے سے روکے اور ناراض ہو تو اس کی ناراضگی کی ہمیں مطلق پرواہ نہ ہو چاہے وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ جب حضورؐ کے دور میں اسلامی تحریک اٹھی تھی اور لوگ شروع شروع میں مسلمان ہونے لگے تھے تو دین کے سبب باپ نے بیٹے کو اور ماں نے بیٹی تک کو چھوڑ دیا تھا اور اللہ کے راستے میں اپنا سب کچھ ہی قربان کر دیا تھا۔ وہ جذبہ اب پھر ہمارے دلوں میں بھڑکنے کا منتظر ہے آؤ اس کے لئے ہم بھی اپنے آپ کو تیار کریں۔

نئی دہلی - ۲۲ اپریل ۱۹۴۶ء

۱۸

پہلے تمہارا ایک خط ملا تھا۔ جس نے تمہارے گاؤں جانے کی خبر دی تھی۔ اس لئے میں نے قلم کو روک لیا۔ کل شام پھر دوسرا خط آیا۔ اس نے اطلاع دی کہ اب جانا ملتوی ہو گیا ہے خود ہی گھروندے بناتی ہو اور خود ہی ڈھا دیتی ہے۔ تم نے دل کی دھڑکن کی بات کی ہے۔ بلاشبہ یہ آواز بہت عجیب ہوتی ہے یا تو قریب ترین رہ کر بھی نہیں سنائی دیتی یا ہزاروں میلوں کی دوری تک اس کی آواز پہنچتی ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بیچش ہوئی تھی۔ یہ صرف ایک دن کی بات تھی۔ اب تو میں بالکل

تندرست ہوں۔ فکر نہ کرو۔

آج کل اسلام کو بھی دوسرے مذاہب کی طرح جامد اور رسمی و رواجی اور نسلی مذہب سمجھنا لوگوں کی عام ذہنیت بن گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے معنی صرف کلمہ گوئی اور نماز روزہ، حج اور زکوٰۃ تک ہی محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ حالانکہ اسلام انسان کی زندگی کا ایک ایک سانس کنٹرول کرتا ہے۔ جب ایک شخص زندگی کے چوبیس گھنٹے اللہ کی زمین پر اس کے آسمان کے نیچے اس کی ہوا میں سانس لیتے ہوئے، اس کے پانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اسی کا پیدا کیا ہوا رزق کھاتے پہنتے اور استعمال کرتے ہوئے یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ فلاں وقت خدا کا بندہ ہے اور فلاں وقت اس کا بندہ نہیں ہے تو وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ فلاں معاملے میں اللہ کے حکم کے مطابق کام کرے گا اور فلاں وقت یا فلاں کام اپنی مرضی یا آباؤ اجداد کے رواج یا دنیا کے دستور کے مطابق کرے گا۔ جو ایسا کرے اس کا دعوئے بندگی جھوٹا ہے وہ ممکن ہے سب کچھ ہو لیکن اصلی مسلمان تو نہیں ہو سکتا۔ اسلام کی حقیقت اور موجودہ لوگوں کی اسلامی ذہنیت، کے متعلق تمہارے خیالات کافی واضح اور سلجھے ہوئے ہیں۔ "ملت آرٹ پروڈکشن" پر تمہارا تبصرہ بھی خوب رہا۔ یہ سب نسلی مسلمانوں کے کارنامے ہیں۔ "غضِ بصر" قرآن کی خاص اصطلاح ہے۔ یعنی "نگاہ پر قابو رکھنا" یہ چیز مرد اور عورت دونوں کے لئے یکساں ضروری ہے۔ حکم ہے کہ اگر کسی مرد کی کسی غیر محرم عورت پر اچانک نظر پڑ جائے تو اسے فوراً نگاہ ہٹا لینی چاہیئے۔ اور عورت کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ نظر نیچی رکھے۔ اخلاق کی بلندی کا یہ بنیادی اصول ہے۔ بُری نظر ہی ذہنی آوارگیاں لاتی ہے۔ خیالات کو ناپاک کرتی ہے۔ نظر ہی انسان کی اندرونی دنیا کا چراغ ہے۔ جب اس چراغ کا تیل ہی غلیظ اور ناپاک ہو جائے تو اس کی ساری اندرونی دنیا دھندلی اور تاریک ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لئے نگاہ پر قابو

تحفظ اخلاق کا بڑا ذریعہ ہے۔ نظر بازی کو آوارگی قرار دیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے پہلی اتفاقیہ نظر تو معاف ہے لیکن دوسری ارادی نظر معاف نہیں ہے۔ اخلاق کی بلندی اور خدا کی حقیقی بندگی صرف اسلام ہی سکھاتا ہے لیکن جب مسلمان "ملت آرٹ پروڈکشن" جیسے ادارے کھولنے میں لگ جائیں تو نظر نیچی رکھنے، غضِ بصر کرنے اور پہلی یا دوسری نظر کی تفریق کا سوال ہی اٹھ جاتا ہے۔

افسوس کہ لوگوں نے مسلمانوں کے دنیوی فوائد کا نام اسلام کی خدمت رکھ لیا ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کو اپنا فائدہ نہیں اسلام کا حکم دیکھنا چاہیئے اس لیے کہ اسی میں مسلمانوں کا فائدہ ہے۔ چاہے بظاہر کتنا ہی بڑا نقصان کیوں نہ نظر آ رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہی ملت آرٹ پروڈکشن والا ذہن اور عمل مسلمانوں کے دنیوی فائدے کے لئے "اسلامی شراب خانے اور اسلامی قمار خانے" اور "اسلامی جوتے خانے" بھی کھولے گا۔ اور ان کا اسلام ہی کے نام سے افتتاح کرے گا۔ کہ اسی میں مسلمان قوم کا فائدہ ہے۔ حالانکہ اگر اسلام کا ایک اصول بھی ساری مسلمان قوم مل کر بدلنا چاہے تو ساری قوم تو غارت ہو سکتی ہے لیکن اسلام کا محکم اصول نہیں بدل سکتی اور یہاں یہ حالت ہو گئی ہے کہ سارا اسلام ہی ان کے اپنے ذاتی فائدوں کے تحت آ گیا ہے۔ جہاں فائدہ دیکھا وہیں اسلام کا نام لے کر چھلانگ لگا دی۔ سود کے لئے اسلامی بنک کھل گئے۔ سود اور قمار بازی کے لئے اسلامی انشورنس کمپنیاں کھل گئیں۔ آنکھوں کا زنا کانوں کا زنا، دل اور ذہن کا زنا اور اخلاق کو تباہ و برباد کرنے اور آوارگی پھیلانے کے لئے "ملت آرٹ پروڈکشن" جیسے ادارے کھل گئے۔ اسلام کہتا ہے کہ غیر محرم کی طرف نظر اٹھانے کی بھی اجازت نہیں ہے اور ملت اسلامیہ کا یہ ادارہ مسلمانوں کے لئے ڈھونڈ ڈھونڈ کر بداخلاقی کے جراثیم جمع کرتا ہے تاکہ اسلام کا نام لے لے کر یہ زہر بھی وہ ہنسی خوشی پیتے جائیں۔ کیونکہ اس میں مسلمانوں کا مادی فائدہ ہے

اور جب مسلمان قوم کا فائدہ ہے تو پھر اسلام کا بھی یہی فائدہ ہے۔

"بہ ایں عقل و دانش بباید گریست"

یہاں گرمی تو واقعی بے پناہ ہے لیکن مجھے تمہارے خیالات گرمی سردی اور بارش کے بارے میں بہت بھلے معلوم ہوئے اور تمہارے اسلامی نقطہ نظر پر مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ انسان کو قرآن شریف میں ناشکرا اور جھگڑالو کہا گیا ہے۔ کسی بات سے وہ مطمئن نہیں ہوتا۔ ہر حالت میں بے اطمینانی کا اظہار کرتا ہے۔ بات بات پر مین میکھ نکالتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ ایسا کیوں نہیں ہے؟ کاش ایسا ہو! بس یونہی شب و روز بے اطمینانی کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ یہ اس کے ناشکرا اور جھگڑالو ہونے کی دلیل ہے۔ گرمی میں گرمی کی شکایت کرتا ہے۔ سردی میں سردی کا رونا روتا ہے۔ بارش میں رطوبت اور کیچڑ کا شکوہ کرتا ہے۔ خزاں میں در و دیوار کی ویرانی کا غم بیان کرتا ہے اور بہار میں شگفتگی کی ناپائیداری اور اس کے جلد گزر جانے کا ذکر کرکے آہیں بھرتا ہے۔ غرض کسی صورت بھی نہ مطمئن ہوتا ہے نہ شکر بجا لاتا ہے۔ حالانکہ سارے موسم اللہ کے پیدا کردہ ہیں اور جس حال میں اللہ رکھے بحیثیت بندے کے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی رضا پر راضی رہیں۔ اگر ہم اللہ سے محبت کرتے ہیں اور ہماری ساری محبتوں کا مرکز ذاتِ الٰہی ہے تو پھر جس کو ہم اتنا محبوب رکھیں اگر اس کے دیئے ہوئے حالات میں، اس کے پیدا کئے ہوئے موسموں میں، اور اس کے پیدا کردہ مصائب پر روئیں تو پھر یا تو ہم اتنے احمق ہیں کہ محبت کے مقام سے بے خبر ہیں یا ہم اتنے جاہل ہیں کہ محبوب کا بھی شکوہ کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ محبت کا مطالبہ اطاعت اور رضا مندی ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ دنیا کے ان معمولی حالات میں خدا کی مخلوق میں سے جب ہم کسی کو چاہتے ہیں تو ہمارا دماغ اس کی یاد سے، ہمارا دل اس کے خیالوں سے اور ہمارا قلب اس کی محبت سے معمور

رہتا ہے اور ہمیں ہر وقت اُس کی رضامندی کا احساس رہتا ہے اور کہاں وہ بلند و برتر محبت جو ساری محبتوں کا منبع ہے اگر ہم اُس کی محبت کا دعوےٰ کریں لیکن اُس کی طرف سے تھوڑی سی آزمائش آجانے پر سارا عشق بھول کر اپنا رونا جگہ جگہ روتے پھریں تو اس سے زیادہ ناشکرا پن اور آدابِ محبت سے بے خبری اور کیا ہے ؟ دنیا میں اپنی کسی محبوب ہستی کا ہم شکوہ کسی سے نہیں کرتے اگر اُس کی طرف سے دکھ بھی پہنچے تو دل ہی دل میں برداشت کرتے ہیں اور کسی کے سامنے زبان نہیں کھولتے تو پھر اللہ کے معاملات میں ہم کیوں شکوہ کرتے ہیں ؛ اور اگر ہم شکوہ کریں تو پھر بندگی کے دعوے، محبت کے اعلان سب جھوٹے دعوے اور صرف بڑے بول ہیں۔

یہاں تبلیغ کا کام خوب چل رہا ہے ۔ کافی لوگ دین سے دلچسپی لینے لگے ہیں ۔ بہت سے احباب پر اچھے تاثرات ہیں ۔ نماز باجماعت کا اہتمام بھی ہو گیا ہے ۔ میں نے بھی ہفتہ میں تین بار نماز فجر کے بعد محلے کی مسجد میں خطبات میں سے ایک خطبہ پڑھ کر نمازیوں کو سنانا شروع کر دیا ہے ۔ لوگوں میں اسلام کے لازمی اور فوری مطالبات کا شعور پیدا ہو رہا ہے ۔

وضع قطع لباس اور شکل و صورت کو اسلامی رنگ دینے کا قصہ بھی ان دنوں ہمارے درمیان بہت چل رہا ہے ۔ بہت سوچ رہا ہوں ۔ ہم جب کسی دوسری قوم کے لباس یا شکل کو اختیار کرتے ہیں تو گویا اُس کو اپنے آپ سے ، اور اُس کی معاشرت کو اپنی معاشرت سے بہتر سمجھتے ہیں اور یہ ذہنی غلامی کی دلیل ہے ۔ رسولِ پاک کی حدیث ہے کہ جو شخص جس قوم کی شکل بنائے گا ۔ جس قوم کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگے گا قیامت کے روز وہ اسی قوم میں سے اٹھے گا ۔ جب ہم ہندوؤں کی طرح چوٹی رکھنا ، ان کی سی دھوتی باندھنا اور ان کی طرح گلے میں جنیو ڈالنا برا سمجھتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ پھر ہم ٹائی ہیٹ وغیرہ کو برا نہ سمجھیں ۔ مجھے تو ان میں کچھ زیادہ فرق محسوس نہیں ہوتا ۔

ضرورت ہے کہ اب ہم مسلمان اسلام کی طرف لوٹیں جو دینِ فطرت ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم ان خیالات سے کس حد تک متفق ہو۔ میں نے اب کچھ دنوں سے ہیٹ اور ٹائی کا استعمال چھوڑ دیا ہے۔ ساری ٹائیاں تقسیم کر دی ہیں۔ جوں جوں اللہ توفیق دے گا اپنے اندر تبدیلی پیدا کروں گا۔ تم بھی مجھے مشورہ دینا کہ آگے کی طرف مجھے کس انداز میں بڑھنا چاہیئے۔ کیا یہ ٹھیک اقدام نہیں ہے۔ ذرا اپنی رائے ضرور تحریر کرنا۔ ان دنوں مجھ پر بڑا انقلابی دور گزر رہا ہے۔

نئی دہلی - ۱۲ مئی ۱۹۴۶ء

۱۹

بہت دنوں سے تمہارے خط کے انتظار میں قلم روکے بیٹھا تھا۔ مجھے شبہ ہو گیا تھا کہ تم گاؤں چلی گئی ہو۔ مجھے ڈر تھا کہ میرے خطوط بھٹکتے نہ رہیں۔ چنانچہ تمہاری طرف سے کسی خبر کے انتظار میں بیٹھا رہا۔ اب تمہارے دو خط بیک وقت ملے ہیں۔ معلوم ہوا کہ التوا کے بعد پھر جانے کا ارادہ بنایا تھا اور اب گاؤں کا تفریحی دورہ کر آئی ہو۔ بہت خوب۔ مبارک ہو۔ فاتحہ پڑھنے کا اصول اور دوسروں کو ترغیب دلانے کا طریقہ جو قبلہ محترم نے بتایا میری نظر میں کچھ مشکوک سا ہے۔ اسلامی شریعت تو "برائی اور نقلِ برائی" دونوں کو برا سمجھتی ہے۔ ایک شخص یونہی کسی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھ آئے تو بہت اچھا ہے۔ کارِ ثواب ہے لیکن اس کا وہاں اس وقت جانا جب کہ اس قبر کے ساتھ ایسے معاملات کئے

جارہے ہوں جو اسلامی نقطہ نظر سے مکروہ یا حرام ہوں تو اس سے پرہیز ہی بہتر ہے میری رائے میں تو یہ مناسب نہیں ہے۔ نامناسب مجلس اور صحبت آدمی کو خواہ مخواہ مشکوک بنا دیتی ہے اور اس کے نامناسب اثرات آدمی پر بہر حال پڑتے ہیں۔

ہم سے انگریز نے تو نہیں کہا تھا کہ تم ڈاڑھی منڈایا کرو۔ لیکن ہم منڈواتے ہیں اور ابوبکرؓ و عمرؓ کی شکل پر چرچل اور سٹالن کی شکل کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہم سے انگریز نے تو نہیں کہا تھا کہ ہمارا لباس پہنو۔ ہماری طرح رہو ہماری نقل کرو۔ عورتوں کو گھروں میں سے سینماؤں میں پہنچاؤ۔ بے حیائی کے طریقے اختیار کرو گانے سنو اور رقص کرو۔ ان میں سے ایک بھی بات انگریز نے ہم سے نہیں کہی تھی۔ لیکن تم دیکھ رہی ہو کہ ہماری سوسائٹی میں ان کی نقل ہی عزت کا نشان بن گیا ہے سب اپنی رضی سے ان کے نقال ہیں۔ بڑے بڑے متقی پرہیزگار نمازی خداترس لوگوں کی اولادیں اس ذہنی غلامی میں مبتلا ہیں۔ کسی کو اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ یہ بُرا فعل ہے اس سے دوسری قوم کے ساتھ تشبہ پایا جاتا ہے۔ حدیثیں سب بیان کرتے ہیں آیات سب سنا دیتے ہیں لیکن عمل کوئی نہیں کرتا۔ کیا ان لوگوں نے سارا عمل گفتگو اور باتوں تک ہی محدود کر لیا ہے اور خدا کی باز پرس سے بچ نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ ڈھونڈ لیا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ساری فضا ہی اس غبار سے اٹی ہوئی ہے۔ اور جو لوگ برائی یا بدعت کے خلاف کلامی جہاد کرتے نظر آتے ہیں وہ خود بھی فضا کے ان اثرات میں مبتلا ہیں۔ پھر تو پرہیز کی اور بھی زیادہ شدت سے ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ علم جو عمل سے خالی ہو سب سے زیادہ تباہ کن ہے۔ اس لئے کہ ایک شخص کو ہدایت نہ پہنچی، وہ بے خبر رہا، اور عمل نہ کر سکا اس کا گناہ اس شخص سے یقیناً کم ہے جسے ہدایت مل گئی۔ علم پہنچ گیا لیکن اس نے اس پر عمل نہ کیا۔ صرف تحسین کے

پھولوں کی بارش کی۔ قوموں پر عذاب بے خبری میں کبھی نہیں آتے پہلے پیغمبروں نے ان تک اللہ کا علم پہنچا دیا جب وہ نہ مانے تو عذاب آئے۔ یہی کیفیت ہر اس شخص کی ہے جو ایک کام کی برائی کو سمجھتا ہے لیکن وہ اس کام میں رسم و رواج یا آباؤ اجداد کی تقلید یا عام لوگوں کے زیر اثر اس میں مبتلا بھی رہتا ہے۔ اللہ ہم سب کو ہدایت دے۔ اور علم کے مطابق عمل کی بھی توفیق دے۔

تم لوگوں نے واپسی میں دریا کے کنارے کنارے سفر کیا۔ بہت پر لطف سفر رہا ہو گا۔ اے کاش میں بھی تمہارے ساتھ ہوتا۔

تم نے بناوٹ اور تصنع سے بیزاری ظاہر کی ہے۔ تمہارے بارے میں مجھے یہ پہلے ہی سے معلوم ہے اور اس پر دلی اطمینان بھی ہے۔ اب تمہاری تحریر دیکھ کر مزید اطمینان ہوا۔ "اسلام کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تمام تکالیف سہہ کر دکھ جھیل کر طعنے سن کر ایک بالکل معمولی سی سادہ سے سادہ زندگی بسر کر سکتی ہوں۔" تم نے یہ لکھ کر مجھے بہت سکون دیا ہے۔ یہی تو مومن کی زندگی کا حقیقی معیار ہے۔ اسلام کو مدِ نظر رکھ کر تکالیف سہنا دکھ جھیلنا اور طعنے سن کر تکالیف برداشت کرنا بہت بڑا جہاد ہے۔ ورنہ اسلام سے ہٹ کر یہی سب چیزیں لعنت اور عذاب بن جاتی ہیں۔ جس طرح اللہ کی راہ میں جان دینے والا شہید کہلاتا ہے اور اس کا درجہ بہت ہی بلند ہے اور اس کے مقابلے میں باطل اور طاغوت اور نفس کی راہ میں جان دینے والا اللہ کا شہید نہیں بلکہ انہی چیزوں کا شہید ہوتا ہے اس لیے اس کو اللہ کی طرف سے اتنی بڑی سخت سزا ملتی ہے کہ جان دینے والا تو اللہ تھا اور اس کی امانت کو کسی دوسرے کی راہ میں کیوں ضائع کیا۔ چونکہ یہ بہت بڑی خیانت ہے اس لیے اس کی سزا بھی بہت بڑی ہے چنانچہ انسان اللہ کی راہ میں تکلیفیں سہنے

سے اللہ کی رحمت اور پیار کا مستحق اور اللہ کی بجائے دوسرے راستوں میں تکلیفیں برداشت کرنے سے اس کے غضب کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اس لئے مجھے تمہارا یہ خیال بہت پسند آیا ہے کہ اسلام کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم دنیا بھر کی تکلیفیں برداشت کر سکتے ہیں۔

دل کو مضبوط رکھو۔ آنے والی تکلیف کے خیال سے خط پڑھ کر آنکھوں میں سے آنسوؤں کا جاری ہونا کیا معنی؟ اگر اللہ کی راہ کے یہ سارے موتی خطوں پر ہی لٹا دیئے تو یہ قیمتی سرمایہ یونہی بے موقع ضائع ہو جائے گا۔

ہمارا شہر اب تک بدستور گرم اور خشک ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ اپنے بندوں پر ہر حالت میں مہربان رہتا ہے۔ چاہے اس کے بندے اس سے کتنے ہی دور بھاگ جائیں۔

تم نے برا نہ ماننے کی گزارش کرتے ہوئے کوثر کے ۲۵ مئی کے تبصرے پر تنقید کی ہے۔ کیا تم نے مجھے بھی یہ سمجھ لیا ہے کہ عام فسادی جماعتوں کے پیروؤں کی طرح کسی کا اندھا مقلد ہوں۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ دنیا میں آنکھیں کھول کر چلے اور جو سچ اور حق ہو صرف اس کو قبول کرے۔ انشاءاللہ تم زندگی بھر یہ کبھی نہ دیکھو گی کہ میں اپنی برائی کی بھی حمایت کروں اور دوسروں کی اچھائی کی بھی مخالفت کروں۔ حق پر وہی شخص چل سکتا ہے جو حق بات کو ہر وقت ہر حال میں سننے سمجھنے اور قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسلام میں یہ بات نہیں ہے کہ میری پارٹی چاہے حق پر ہو یا ناحق پر میں بہرحال اس کی تائید کروں گا۔ بلکہ یہاں کا اصول یہ ہے کہ حق کی تائید کی جائے گی چاہے وہ غیر کے پاس ہو اور ناحق کا ہاتھ پکڑا جائے گا چاہے وہ اپنوں کا ہاتھ ہی کیوں نہ ہو۔

مجھے مسرت ہوئی کہ تم نے مشتبہ بات پر فوراً تنقید کر دی۔ یہی مومن کی شان ہے کہ

جونہی اس کا ضمیر کھٹکتا ہے وہ فوراً اس بات کو ٹوکتا اور روکتا ہے، نہ وہ بادشاہوں سے ڈرتا ہے اور نہ دنیا کی کسی اور قوت سے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ جب خلیفہ ہوئے تو انہوں نے اپنی تقریر میں پہلی بات یہی کہی کہ اگر میں حق بات کہوں تو اسے مانو اور جو اللہ کی راہ سے ہٹ جاؤں تو مجھے پکڑ کر سیدھا کر دو" یہ اس خلیفۃ المسلمین کے الفاظ ہیں جنہوں نے اسلام کو گود میں پالا اور جس کے لئے اپنا تن من دھن سب کچھ لٹا دیا۔ یہی ہر مومن کا مشن ہے کہ اپنی عزیز سے عزیز برائی کو بھی نفرت سے دیکھے اور اسے دبانے اور ختم کرنے کی کوشش کرے اور نیکی اور اچھائی اسے جہاں بھی نظر آئے اسے اپنی سمجھ کر اپنا لے۔

تبصرے میں جو بات تمہیں کھٹکی ہے کہ اجتماع کو حج سے نسبت دے دی گئی یہ بات تبصرہ پڑھتے ہی مجھے بھی کھٹکی تھی لیکن میں نے غور کیا تو مجھ پر بات صاف ہو گئی۔ حج اللہ کی عبادت کا ایک مظہر ہے اور مومن اللہ کا مطیع فرمان سپاہی ہے۔ جو دنیا میں اللہ کی حکومت قائم کرنے پر مامور ہے۔ سپاہی کے لئے اصل مقصود اپنے بادشاہ کی حکومت اور اسکے اقتدار کو سربلند کرنا ہے۔ باقی چیزیں جو اس کی سپاہیانہ زندگی کے روزمرہ کے مشاغل ہیں وہ اصل مقصود کے تحت مطلوب ہیں۔ سپاہی کا فرض ہے کہ اپنے بادشاہ کی حکومت کے لئے لڑے، مرے، جان دے اور اپنے آقا کی حکومت کو قائم کرنے کے لئے ہر طرح کی قربانی دے۔ مومن جو اللہ کا سپاہی ہے اس کا بھی یہی حال ہے کہ وہ نماز پڑھتا ہے روزے رکھتا ہے۔ پانچ وقت اذان کی آواز سن کر سپاہی کی طرح دوڑتا ہے سال میں مہینہ بھر روزے رکھ کر اپنے نفس کو قابو میں رکھنے، صبر کرنے اور بھوکا رہنے کی مشق کرتا ہے۔ زکوٰۃ دے کر مالی قربانی دینا سیکھتا ہے۔ زندگی میں ایک بار دنیا بھر سے حج کے لیے جمع ہو کر اپنے مالک کے لئے فدائیت کا مظاہرہ کرتا ہے اور اس ساری تگ و دو کا اصل ہدف یہی ہوتا ہے کہ وہ

اپنے مالک کی اطاعت بجا لائے اور اللہ کی حکومت کو قائم کرے - اب اگر اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے جدوجہد کرنے والا کوئی گروہ جمع ہو کر حکومت الٰہیہ کے قیام کی مساعی کو تیز تر کرتا ہے تو یہ بھی مالک کی اطاعت اور عبادت ہی کی ایک صورت ہے اور چونکہ دینی مقاصد کے لئے ایسے لوگوں کا بڑا اجتماع اپنی شکل و صورت کی بعض جزیات میں حج کی عبادت کے مشابہ ہے - سفر کی تکالیف اخراجات مشقت رضائے الٰہی کے حصول کا جذبہ وغیرہ اس لئے جزوی طور پر اظہارِ مدعا کے لئے ایسی تشبیہہ درست تو ہے البتہ مناسب نہیں ہے - بس ذرا ایسے اظہار خیال کو حدود کے اندر ہی رکھنا ضروری ہوتا ہے - اور اس کے لئے تنقیدی نگاہوں کا جائزہ اور حسنِ نیت بہت کافی ہے -

تم نے میرے شکستہ خط کی شکایت کی ہے دراصل میں ذرا تیز لکھنے کا عادی ہوں ہوتا یہ ہے کہ خیالات کی تیزی کی وجہ سے قلم کو بھی ساتھ ساتھ تیز ہی چلنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے قلم صاف نہیں لکھ سکتا اور خیالات کے ساتھ قلم نہ چل سکے تو پھر دقت ہوتی ہے بہرحال مزید صاف لکھنے کی کوشش کروں گا -

نئی دہلی - ۱۱ جون ۱۹۴۷ء

۲۰

آج دو مکتوب ملے - کبھی پیاسے کو قطرہ بھی میسر نہیں آتا اور کبھی چشمے انڈیل دیئے جاتے ہیں - دو علیحدہ تاریخوں کے خطوط کو ایک ہی تاریخ میں پہنچانے کی ادائے محبوبی

ڈاکخانے والوں نے بڑی بے دردی سے ایجاد کرلی ہے۔

میرے خط کی غلط تاریخ والی بات تو واقعی بڑی دلچسپ ہوگئی۔ کوئی اس پر خوب خوب ہنس سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اب خطوط پر ہجری تاریخیں لکھنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن میرے پاس ہجری کیلنڈر نہیں ہے۔ اخبار دیکھ کر اندازے سے لکھتا ہوں۔ انگریزیت سے بچنے کی کوششوں میں سے یہ بھی ایک کوشش ہے۔ یہ بدقسمتی ہے کہ ایک قوم نے دوسری قوم کو اس کی تاریخ اور تقویم تک بھلا دی ہے۔ بہرحال اسلامی شعور کی ابتداء کے ساتھ پرانی عادات ایسے لطیفے پیدا کردیتی ہیں۔ کل ایک اور لطیفہ ہاتھ آیا کچھ دن ہوئے ہم نے ایک ہوٹل میں رس گلے کھائے۔ اگرچہ چند ایک ہی کھائے لیکن ان کمبختوں نے معدہ میں جاکر مستقل ٹھکانہ ہی بنا لیا اور بھوک ہی نہ لگی۔ دوپہر سے رات کے نو بجے تک قطعی بھوک نہ تھی اس لئے کہ پیٹ میں رس گلے رکھے ہوئے تھے۔ اب ہم نے سوچا کہ روزے آرہے ہیں۔ بھوک بری طرح ستایا کرے گی سحری رس گلوں سے ہوا کرے اور افطاری کسٹرائل سے صبح دو رس گلے کھا لئے اور دن بھر مزے سے گزار لیا۔ شام کو کسٹرائل سے روزہ افطار کرلیا۔ کتنی مزے کی تجویز ہے آج کل احباب میں اس لطیفے پر خوب قہقہے لگ رہے ہیں۔

تمہارا پرچہ سہ روزہ کوثر کسی نے چرالیا ہے۔ شکر کرو ایک ہی گم ہوا۔ میرے تو اب تک تین پرچے گم ہوچکے ہیں۔ یہ تو مادی معاوضے کے بدلے میں مادی کوثر ہے جس کے لئے تم یوں پریشان ہوگئیں جسے چرایا بھی جاسکتا ہے لیکن اللہ کی حقیقی اطاعت کے بعد اللہ کے خوش بخت بندوں کو وہ ارفع اور پاکیزہ کوثر میسر آئے گا جسے نہ کوئی چرا سکے گا اور نہ کوئی گم کرسکے گا۔ اس لئے ہماری ہر کوشش کا مرکز صرف رضائے الٰہی کو ہی ہونا چاہیئے

اور اس کے انعام میں اسی جاوداں کوثر کی امید رکھنی چاہیئے ۔ ہماری جدوجہد کا مقصود تو خود کوثر بھی نہیں ہے بلکہ مالک کی رضا اور اطاعت ہے ۔ تم نے یہ روایت سنی ہوگی کہ حضرت رابعہ بصری جو ایک مشہور خدا رسیدہ خاتون تھیں ان کی خدمت میں چند بزرگ بیٹھے تھے ۔ ایک بزرگ نے کہا کہ " میں جب دوزخ کی جلن، تپش اور شدت کا خیال کرتا ہوں تو کانپنے لگتا ہوں اور اللہ کی عبادت میں مشغول ہو جاتا ہوں کہ وہ مجھے دوزخ سے محفوظ رکھے " ۔ دوسرے نے کہا " میں جب بہشت کی نعمتوں کا تصور کرتا ہوں تو اللہ کی عبادت میں زیادہ سے زیادہ انہماک کرتا ہوں کہ وہ مجھے میسر آ جائیں ۔" حضرت رابعہ بصری نے فرمایا " تم کیسے مزدور ہو کہ ایک اپنے مالک کی عبادت لالچ سے کرتا ہے اور دوسرا خوف سے ۔ کیا اگر بہشت اور دوزخ کا وجود نہ ہوتا تو وہ ذات برتر و بلند عبادت اور پرستش کی مستحق نہ تھی ۔" بس عبادت کا صحیح مقصود تو اللہ کی رضا کا حصول ہی ہے ۔ صرف خوف اور صرف لالچ کافی نہیں بلکہ اللہ کی ذات سے تو خوف اور محبت دونوں کی انتہا ہونی چاہیئے ۔ اور صرف اس لئے کہ اس کی رضا حاصل ہو جائے بہشت اور اس کا کوثر دنیا اور اس کی بادشاہی یہ سب اللہ کی طرف سے اِس دنیا یا اُس دنیا کے انعام تو ہو سکتے ہیں لیکن انعام کے لالچ میں کیا ہوا کام کم اہمیت رکھتا ہے ۔ خصوصاً اس دنیا میں تو جتنے زیادہ لوازمات ایک شخص کو ملتے ہیں اتنی ہی زیادہ اس کی آزمائش میں سختی ہوتی ہے اور اس کے بھٹکنے کا خطرہ بھی زیادہ ہوتا ہے ۔

تم نے لکھا ہے کہ امی ابا کہتے ہیں کہ ابھی طویل مدت تو لوگوں میں سے نظام باطل کا پیدا کردہ خون صاف کرنے میں لگ جائے گی ۔ یہ بڑی وزنی بات انہوں نے فرمائی ہے بے شک دین کا کام کرنے کے لئے پہلے اپنی اصلاح کی سخت ضرورت ہے اور نظام باطل

کی ڈالی ہوئی عادات کی بیخ کنی اصلاح ذات کی پہلی کڑی ہے۔ ہم تو خیر مسلمان کہلانے والے لوگوں کے گھروں میں پیدا ہوئے ہیں اور ہمارے پیدا ہوتے ہی دنیا کی سب سے پہلی آواز لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ ہمارے کانوں میں پہنچائی گئی۔ چاہے اس آواز کو پہچاننے والے بھی اس آواز اور اقرار کی ذمہ داریوں سے بے خبر ہی تھے لیکن حضرت ابوبکر رض صدیق جو بوڑھے ہو چلے تھے۔ حضرت عمر رض حضرت عثمان رض اور دوسرے مقتدر صحابی جنہوں نے اپنی طویل ابتدائی عمریں اسلام سے بے خبری میں گزاری تھیں۔ بس ایک ہی بار لا الہ الا اللہ کہنے سے اتنے قرب خداوندی کے مستحق ہو گئے کہ امت میں ان سے بڑھ کر کوئی نہ ہوا اور نہ ہو سکے گا۔ دراصل نظام باطل میں گزاری ہوئی عمر کا حساب لگانے کی ضرورت نہیں اخلاص کے ساتھ مالک سے کیا ہوا عہد وفاداری بھول چوک کی فرد گزاشتوں کو محو کر دیتا ہے۔ اگر حساب یہ ہوتا کہ جتنے سال باطل کے ساتھ رہے اتنے ہی سال حق کی تابعداری کی جائے۔ تب تو معاملہ بڑا مشکل ہو جاتا۔ کلمہ پڑھتے ہی کھجوروں کی جھولی الٹ کر اور میدان جہاد میں جان دے کر ایک نماز پڑھے بغیر بھی تو لوگ بہشت میں چلے گئے تھے اللہ پاک تو انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اس تک پہنچنے کے لئے عمریں یا سال تو نہیں چاہیئے۔ اس کی ربوبیت اور اپنی بندگی کا اقرار اور محمد ص کی پیروی کا پختہ وعدہ سچے دل سے کر کے انسان کو ایمان کی وہ دولت حاصل ہوتی ہے جو دنیا و آخرت کی سب سے بڑی دولت ہے۔ بس ایک سچا عہد وفا ہی کافی ہے۔ تم حق کی طرف آنے کے لئے گزری ہوئی عمروں اور سالوں کا حساب کیوں لگاتی ہو۔ ان سالوں اور برسوں کی ساری فرد گزاشتیں تو سچے دل سے ایک توبہ کا اقرار ہی دھو دیتا ہے۔ البتہ آگے بڑھنے کے لئے جد و جہد ضروری ہے جو توبہ کی صداقت کی

تائید یا تردید کر دیتی ہے۔

میری خط و کتابت کے نتیجے میں بڑے ابا بھی نیم قائل ہو رہے ہیں اور مطالعہ شروع کر دیا ہے۔ دل خوش کن خبر سے مسرت ہوئی کہ "شاکا" مجھے یاد کرتی ہے لیکن "الّو تو" طوطا چشم ہے وہ جو آئے اسی سے دلچسپی رکھتی ہے اور جو چلا جائے اسے بھول جاتی ہے۔ امی ابا کے تفکرات کا تم نے ذکر چھیڑ دیا ہے۔ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ وہ ان معاملات میں بڑے حساس ہیں برسوں بعد کی باتیں سوچا کرتے اور فکرمند ہوتے رہتے ہیں۔ دور اندیشی کے لحاظ سے یہ چیز مفید بھی ہے اور مضر بھی۔ اللہ کی مصلحتیں تو وہی خوب جانتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہم آج ایک تجویز مرتب کرتے ہیں اور اس کے لئے سارے اسباب مہیا کرتے ہیں اور چونکہ وہ اللہ کو منظور نہیں ہوتی اس لئے وقت آنے پر وہ کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ مخلصانہ کوشش کے ساتھ مخلصانہ توکلِ الٰہی بھی بہت ضروری ہے۔ البتہ میری کسی بات سے ان کو فکر لاحق ہو تو ضرور لکھنا تاکہ میں بے خبر نہ رہوں اور کچھ کر سکوں

پچھلے دنوں ایک کتاب کی تلاش تھی۔ "الجہاد فی الاسلام"۔ مارکیٹ میں ختم ہے۔ بڑی مشکل سے ایک دوست سے ایک دن کے وعدے پر لایا ہوں۔ بڑے سائز کے پانچ سو سے زائد صفحات ہیں۔ دفتر سے چھٹی لے کر اس کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ آج رات کو حسبِ وعدہ واپس کرنی ہے۔ مولانا محترم نے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ سنا ہے کہ علامہ اقبال مرحوم نے بھی اس کتاب کی تعریف کی تھی۔ کتاب واقعی عظیم الشان ہے۔ مسئلہ کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا گیا ہے۔ پھر اندازِ بیان دوسرے مصنفین کی طرح معذرت خواہانہ نہیں ہے بلکہ اصول پسندانہ اور حقیقت پسندانہ ہے۔ مجھے مولانا محترم کی یہ بات بہت پسند آئی ہے کہ وہ اپنے اسلام پر کسی جگہ بھی دوسرے لیڈروں اور مصنفین کی طرح شرماتے ہوئے

نظر نہیں آتے بلکہ اسلام کی تعلیمات کو ڈنکے کی چوٹ بیان کرتے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبال کے بعد یہ تیسرے آدمی ہیں جو اس طرز کے میری نظر سے گزرے ہیں۔ لیکن ان کا رنگ ان دونوں سے مختلف اور داعیانہ ہے۔ اُن کے ہاں جذبات کو اپیل تھی تو یہاں استدلال کے زور سے اسلام کی دعوت ہے۔ اگر ان تینوں کا مِلا جُلا مطالعہ کیا جائے تو دل و دماغ مومن اور روشن ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی میری اس رائے سے متفق ہوگی۔

نئی دہلی - ۲۳ جون ۴۶ء

۲۱

تمہارا خط کل ملا۔ آج چھٹی کا دن ہے۔ بہت سے خطوط کے جوابات، ایک ضروری کتاب کا مطالعہ اور دیگر کئی کام جمع ہو گئے ہیں جن سے آج فارغ ہونا چاہتا ہوں۔

لکھتی ہو "میں تو اس لئے خط جلد نہیں لکھا کرتی کہ پھر آپ اکتا جائیں گے"، اس "نوازش" اور "ہمدردی" کا بہت بہت شکریہ۔ ایک بیمار کو دوا اس لئے نہ دی جائے کہ اسے کہیں بُری معلوم نہ ہو۔ کیسی اچھی ہمدردی ہے۔ ماشاءاللہ بڑے سے بڑے سنگ دِل کو ایسی محبت بھری ہمدردی پر رشک کرنا چاہیئے۔ ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے۔ بہتر ہوتا کہ میرے حصے کا انتظار بھی تمہیں ہی میسر آ جاتا۔

تم نے بچپن کی یاد دلائی ہے۔ بچپن کی یاد میرے لیے تلخ بھی ہے اور شیریں بھی۔ لیکن یاد ہمیشہ زمانے کی دھندلاہٹ اور چھلنی میں سے گزر کر آیا کرتی ہے اس لئے تلخیوں

کے احساسات پیچھے چھوڑ آتی ہے جیسے ہم اپنی بڑی سے بڑی بیماری یا زخم یا چوٹ کو یاد کرتے ہیں تو ذہن میں اس کا نقشہ تو ضرور آجاتا ہے لیکن اس کی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا جو گزر چکی ہو۔ اسی لیے ہر قسم کی یاد چاہے وہ دکھ بھری یاد ہی کیوں نہ ہو ماضی کے فاصلے میں گزر کر اپنی تلخی کھو دیتی ہے اور دلفریبی لے آتی ہے۔ یہ تو ہے گزرے زمانے کی یاد۔ لیکن جب کسی عزیز ہستی کی یاد آتی ہے۔ تو چونکہ وہ یاد کسی طرح بھی اس ہستی کے برابر دلکشی اور محبت نہیں رکھتی اس لئے یہ یاد شیریں سے زیادہ تلخ ہوتی ہے اور اس ہستی کی کمی کو اور زیادہ شدت سے محسوس کراتی ہے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ کوئی خوش بخت آدمی اس یاد کو یادِ الٰہی میں مدغم کرنے کی کوشش کرے ورنہ مجھ جیسا گناہ گار آدمی کتابوں کے مطالعہ سے دل بہلایا کرے۔ ایک شاعر نے تو یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ " ان سے تو ان کی یاد ہی اچھی ہے "جو ہجر اور جدائی میں آکر میری خبر لیتی ہے" لیکن اس قسم کے خیال کو میں کم ظرفی سمجھتا ہوں۔ کسی محبوب ہستی سے اس کی یاد کو بڑھا دینا سخت کور ذوقی بلکہ بد ذوقی ہے۔ بلکہ یاد ہستی سے مختلف شے نہیں ہے۔

ُشا کا ' کی باتیں خوب پسند آئیں۔ اس نک بھائی جان کا پیار پہنچا دینا۔

پرسوں چچا جان یہاں پہنچ گئے ' بخیریت ہیں۔ میں بلا تکلف مل آیا میری کم آمیزی سے بعض لوگ برا منا جایا کرتے ہیں لیکن میں تکلفاً کوئی کام کرنے میں بہت بوجھ محسوس کرتا ہوں۔ مومن تو صاف دل ہوتا ہے۔ سادہ ہوتا ہے اور بے غرض ہوتا ہے نہ اس کی گفتگو میں کوئی تکلف ہوتا ہے اور نہ ملنے میں کوئی بناوٹ ہوتی ہے اس لئے گھٹیا قسم کی رسمیات سے وہ بلند رہا کرتا ہے۔ رسمی نہیں میں تو حقیقی ملاقات کا قائل ہوں۔ ہمارا شہر ان دنوں گرم نہیں ہے صرف نیم گرم ہے۔ البتہ فسادات کی بہت

گرما گرمی ہے۔

نئی دہلی - یکم جولائی ۴۶ء

(۲۲)

بہت دنوں کے بعد تمہارا خط ملا۔ میں ہی جانتا ہوں کہ تمہاری اس طویل خاموشی کو میں نے کس طرح گزارا ہے۔ گویا دل کا ایک مسلسل روزہ تھا۔ تم تو اپنے ہی دل کو دیکھتی ہو شاید اسی لئے میرے دل کا اندازہ کم لگاتی ہو۔

روٹھنے کی بات خوب کہی۔ ایسی حالت میں کوتوال بیچارہ کیا کرے۔ جب چور ہی اسے ڈانٹے۔ روٹھنے کے لئے بھی ایک منانے والے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح رونے کے لیے ایک آنسو پونچھنے والے کی ضرورت ہوتی ہے۔ روٹھنا جب ہی لطف دیتا ہے جب کوئی ساتھ ساتھ منانا بھی جائے۔ منانے والے کے بغیر روٹھ کر بیٹھنا حماقت بلکہ پاگل پن ہے۔

میرا مضمون دیکھ کر تمہیں مذاق اڑانے کا موقعہ ہاتھ آگیا۔ خدا ان کاتب حضرات سے سمجھے جو میرا نام اکثر غلط لکھ کر اچھے بھلے انسان کو جنگل کا بادشاہ بنا دیتے ہیں۔ تنگ آکر سوچ رہا ہوں کہ اپنا یا ادبی نام ترک کر دوں۔ ادبی نام رکھنے کی روش ویسے بھی اب بہت فرسودہ ہو گئی ہے۔ بہت دنوں بعد کل میں نے ایک اسلامی ادب کا افسانہ لکھا ہے۔ اسلامی ادب کی راہ انوکھی اور نئی راہ ہے۔ پہلے اردو کے سارے بڑے بڑے پرچے میرا ایمان

تھے۔ جس میں چاہتا لکھتا اب یہ سارے پرچے میرے لئے ممنوعہ علاقہ ہو کر رہ گئے ہیں اور بنا بنایا میدان دور دور تک صحرا صحرا نظر آتا ہے۔ یہاں تو نئے راستے خود ہی بنانے ہوں گے اور پھر خود ہی سفر کرنا ہو گا۔ بہرحال یہ بھی کریں گے۔

منجھلے چچا کی موت واقعی دردناک ہے۔ بڑے خوش باش انسان تھے جن دنوں میں بمبئی میں زیرِ تعلیم تھا وہ وہاں فوج میں ملازم تھے۔ والد صاحب سے دور رہنے کے سبب میں اکثر اداس رہا کرتا تھا۔ چھوٹی عمر تھی۔ منجھلے چچا ہم سے پانچ میل دور ہونے کے باوجود روزانہ شام کو ملنے آیا کرتے تھے۔ بہت ہنس ہنس کر باتیں کرتے اور دل بہلاتے، مجھ سے میری تعلیم کی باتیں کرتے، سیر کے لئے سمندر پر اپنے ساتھ لے جایا کرتے۔ کئی بار مجھے اپنے ساتھ انگریزی پکچر دیکھنے بھی لے گئے۔ میں خاک بھی نہ سمجھتا تھا بس بیٹھا ہوا تصویریں ہی دیکھا کرتا۔ انہی دنوں انہوں نے ایک دو افسانے بھی لکھے تھے جن میں سے ایک افسانہ "سرخ گلاب" کے عنوان سے مجھے اب تک یاد ہے۔ اب ہمارا ان سے آخری تعلق صرف دعائے مغفرت ہے۔ اب تو ان کا وہی شخص زیادہ عزیز ہے جو نماز اور قرآن مجید پڑھ کر ان کی روح کو ایصال ثواب کیا کرے۔ اب ان تک آنسو تو نہیں پہنچ سکتے۔ البتہ عملِ خیر کا کچھ ثواب پہنچ سکتا ہے۔ آنسو جانے والے تک نہیں پہنچتے لیکن ثواب پہنچ بھی جاتا ہے اور راحت بھی پہنچاتا ہے۔ چچا جان کی موت سے متاثر ہو کر تم نے لکھا ہے "جی چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر صرف اسی واحد ہستی کی طرف لوٹ جاؤں جہاں چچا جان گئے ہیں" مسلمان موت سے کبھی نہیں ڈرتا۔ علامہ اقبال نے بھی مردِ مومن کی یہی شان بیان کی ہے۔ "نشانِ مردِ مومن با تو گویم — چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست" یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ موت بھی اللہ کا ایک حکم ہے، جیسے روح اللہ کا حکم ہے اور موت اسی حکم کی واپسی ہے۔

مسلمان اللہ کا تابع اور فرمانبردار ہے، فرمانبردار کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ آقا سے اس کی مرضی کے خلاف آرزوئیں کیا کرے۔ وہ تو حکم کا بندہ ہے۔ جب تک وہ اپنے کسی بندے کو دنیا میں رکھنا چاہے اس کے سامنے کسی کا کیا زور ہے۔ اس کی مرضی سے پہلے موت کی تمنا بھی غلط ہے اور جب وہ اپنے بندے کو بلانا چاہے تو پھر مزید زندگی کی آرزو بھی غلط ہے۔ پھر موت کو بے وقت قرار دینا مزید غلط ہے۔ موت تو ہمیشہ اپنے مقررہ وقت پر آتی ہے اور کبھی بے وقت نہیں ہوتی۔ دنیا میں مسلمان کا تو کام ہی یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کرے اور اپنے گردوپیش میں اللہ کی اطاعت کو نافذ کرے۔ پہلے اپنے نفس پر، پھر اپنے گھر پر، پھر اپنے حلقہ اثر میں، اور پھر آہستہ آہستہ ساری سوسائٹی میں۔ مسلمان تو اللہ کی اطاعت نافذ کرنے کے لئے پتھر بھی کھاتا ہے۔ گالیاں بھی سنتا ہے۔ طعنے بھی برداشت کرتا ہے اور اگر اس کا مذاق بھی اڑایا جائے تو وہ اسے بھی صبر اور خاموشی سے برداشت کرتا ہے۔ اس کے باوجود موت کی تمنا اس لئے نہیں کرتا کہ اس کا مالک اس سے اپنی دنیا میں اصلاح کا کام لینا چاہتا ہے۔ وہ اپنے مالک کی زمین کو سرکشوں سے پاک کرتا ہے اور دنیا کو شر سے بچانے کے لئے وقت آنے پر تلوار بھی اٹھاتا ہے اور مالک کے کام کے لئے زمانے کا ایجاد کردہ ہر جدید ہتھیار دین اسلام کی سربلندی کے لئے استعمال کرتا ہے اسی کا نام جہاد ہے۔ اب جب کہ مسلمان خواب غفلت میں سوئے ہوئے ہیں ہمارا فرض ہے کہ زبان اور عمل کے ذریعے جہاد کریں۔ یہاں تک کہ دنیا خود گواہی دے کہ شہادت حق کا حق ادا ہوا اور جان لے کہ یہ نیک بات ہے اور وہ نیک عمل ہے اس لئے کہ نیک بات اور نیک عمل کو ہر دور اور ہر سوسائٹی میں نیک ہی کہا جاتا ہے۔ چاہے ساری دنیا شیطانوں سے بھر جائے۔ نیکی ایک ایسی چیز ہے

کہ وہ لوگ جو نیکی سے دور رہتے ہیں اور ہمیشہ بدی میں مصروف رہتے ہیں وہ بھی نیکی کی اچھائی اور اعتراف سے کبھی انکار نہیں کر سکتے۔

تمہیں سن کر خوشی ہوگی کہ روز روز کی تبلیغ کے نتیجے میں اب چچا جان نے بھی پانچوں وقت کی نماز شروع کر دی ہے۔ با ترجمہ قرآن مجید بھی پڑھنے لگے ہیں۔ اسلام کی باتیں بھی خندہ پیشانی اور ذوق و شوق سے سنتے ہیں اور کچھ کچھ اسلامی کتب کا مطالعہ بھی شروع کر دیا ہے۔ یہاں جتنے سرکاری ملازمین میرے آس پاس رہتے ہیں ان سب کو ایک بار بلا کر میں نے باجماعت نماز کے لئے درخواست کی تھی۔ چنانچہ اب ہمارے مکان کی چھت پر روزانہ اذان اور نماز باجماعت شروع ہوگئی ہے۔ میرے پاس ویسے بھی اسلامی لٹریچر کی ساٹھ ستر کتابیں موجود ہیں جن میں سے میں نے ایک مفت گشتی لائبریری کا شروع کر دی ہے لوگ اس سے بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ لوگوں میں آہستہ آہستہ اسلامی معلومات سے دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے اللہ کا شکر ہے کہ وہ مسلمانوں میں سے بعض لوگوں کے اندر پھر اسلامی زندگی کا شعور بیدار کر رہا ہے۔

تبلیغ کے نتیجے میں لوگوں کی تلخ و تند باتوں سے بالکل خوف نہ کھاؤ۔ ہر وہ فعل جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نگاہ میں صحیح اور مناسب ہے درحقیقت وہی مناسب ترین ہے چاہے ساری دنیا اس کی مخالفت کرے اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نگاہ میں برا ہے وہ بدترین ہے چاہے کوئی ہزار اس کی تعریف کرے۔ ایسی باتوں سے تم متاثر نہ ہوا کرو۔ مسلمان کسی سے نہیں ڈرتا سوائے اللہ کے۔

ہاں جو کتب میں بھجوا دیتا ہوں ان کے علاوہ بھی جو کتابیں تمہیں پڑھنے کا شوق ہو مجھے لکھ بھیجو۔ میں وقتاً فوقتاً تمہیں بھیجتا رہوں گا۔ دارالسلام والوں کی شائع کردہ

ساری کتابوں کا میں مطالعہ کر چکا ہوں اور بعض کتب کا مطالعہ اب دوبارہ شروع کر دیا ہے ۔ بہتر ہوتا کہ ان فرصت کے دنوں میں تم بھی سب کتابوں کو ایک بار پھر دیکھ لیتیں ۔ اس سے سب بھلی باتیں از سر نو تازہ اور پختہ ہو کر ذہن میں محفوظ ہو جاتی ہیں اور ساتھ ہی کسی سے تبلیغی گفتگو کرتے ہوئے دلیل اور بات کا طریقہ بھی ہاتھ آجاتا ہے ۔ میں اپنی فیلٹ کیپ وہیں چھوڑ آیا تھا بھائی جان آئیں تو انہیں دے دینا میں نے اب اسے پہننا ترک کر دیا ہے ۔ انہیں "مسلمان اور سیاسی کشمکش" دیکھنے کا شوق تھا اگر وہ وہاں آئیں تو تم انہیں پڑھنے کے لیے دے دینا وہ خود پڑھ کر اور اپنے دوستوں کو پڑھوا کر پھر لوٹا دیں گے ۔ تم سے کہنے کے لئے اب اتنی باتیں جمع ہو گئی ہیں کہ میں اس خط کو نامکمل سمجھتے ہوئے ختم کرتا ہوں ۔ چپ چاپ لڑکی سرور اور 'شاکے' کو بہت سا پیار ۔

نئی دہلی ۔ ۱۶ جولائی ۱۹۴۶ء

---

(۲۳)

آج صبح میں نے ایک خط لکھا تھا لیکن میرے خیال میں وہ کچھ اتنا ناکافی اور نامکمل تھا کہ گویا میں نے تمہیں خط لکھا ہی نہیں ۔ اجتماع سے واپسی کے بعد دل و دماغ اور روزمرہ کی زندگی میں اتنا بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے کہ اسے الفاظ کے کھوکھلے پن سے بھرنا مشکل ہو رہا ہے الفاظ بھی عجیب چیز ہیں ، غالباً الفاظ سے زیادہ سستی چیز دنیا میں اور کوئی نہیں اور نہ ہی الفاظ سے زیادہ گراں اور محکم چیز کوئی اور ہے ۔ دونوں مخالف اور متضاد صفات ان کے

اندر بیک وقت موجود ہیں۔ وہ الفاظ جو حلق سے پیدا ہونے اور زبان سے ادا ہو جاتے ہیں اور جن کے وجود اور تخلیق کی خبر تک دل کو نہیں ہوتی۔ پھسپھسے۔ بے وقعت۔ بے وزن اور سستے ہوتے ہیں۔ اور وہ الفاظ جو پوری احتیاط سے دل سے اٹھتے ہیں اور قلب کی آواز بن کر زبان سے نکلتے ہیں ان کی محکمی اور مضبوطی کی مثال دنیا کی کسی اور چیز سے نہیں دی جا سکتی۔ بڑے سے بڑا جبر و تشدد اور اندیشۂ زیاں ان کو بدل نہیں سکتا۔ وہ اپنی جگہ قلعے کی سی مضبوطی سے قائم رہتے ہیں۔ کہنے والی زبانیں بند ہو جاتی ہیں مٹ جاتی ہیں لیکن الفاظ قائم رہتے ہیں ہمیشہ اور تا قیامت بلکہ دوسری زندگی پر بھی ان الفاظ کی ویسی ہی حکمرانی رہتی ہے۔ انہیں محکم الفاظ میں مومن کا اقرارِ شہادت ہے جس کے ذریعے وہ اپنے مالک کی بندگی کا دم بھرتا اور اس کی چاکری کا عہد کرتا ہے۔ اسی طرح دوسرے درجے کے محکم الفاظ اس "اقرارِ قبولیت" کے ہوتے ہیں جب ایک ہستی ایک دوسری ہستی سے زندگی بھر کی رفاقت کا عہد کرتی ہے۔ اس وابستگی میں خلوص ایفائے عہد ہمدردی اور وفاداری سبھی کچھ آجاتا ہے۔ اس عہدِ وفا کو نبھانے کے لیے باہمی رفاقت میں دکھ درد۔ رنج والم مسرت وانبساط تنگی و ترشی۔ آرام اور تکلیف بھوک اور آسودگی سب کچھ آجاتا ہے۔ ایک ہستی کا بہت کچھ دوسری ہستی سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ باہمی یکجہتی اور تعاون سے حالات واطوار بدلتے اور گفتگو کے انداز تک بدل جاتے ہیں۔ ذہن متاثر ہوتا ہے۔ رہنا سہنا اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا یکساں ہو جاتا ہے اور وہ ایک "اقرارِ قبولیت" جو باہمی کیا گیا ہوتا ہے زندگی کے مختلف گوشوں پر ہمہ گیر اثرات ڈالتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو وہ اقرار کھوکھلا رہتا ہے اور درمیانی ہولناک خلا، اجنبیت سے گونجتا رہتا ہے۔ یہی وہ اقرارِ قبولیت کے اثرات ہیں جن کو تم نے یوں بیان کیا ہے۔ "خدا جانے مجھے کیا ہو گیا

سے میں بالکل بدل گئی ہوں" یہ تبدیلی وہی ہے جو اقرارِ قبولیت کے محکم الفاظ کی حقیقی روح قبول کرنے کا لازمی نتیجہ ہے۔

اس سچے اقرارِ قبولیت کا لازمی اور فوری نتیجہ ایک روحانی ذہنی جسمانی خیالی اور معاشرتی وابستگی ہوتی ہے اور اسی وابستگی کا نام ہم اپنے روزمرہ کے معمولات میں محبت رکھ لیتے ہیں۔ یہ لفظ "محبت" اپنے وسیع معنوں کے لحاظ سے اس تمام عمل کو واضح کرتا ہے جسے اقرارِ قبولیت کے بعد محکم تعاونِ باہمی اور فکری ہم آہنگی کا لفظ ادا کر سکتا ہے۔ غرض محبت وہ درمیانی رشتہ ہے جو دو دلوں دو ذہنوں اور دو مزاجوں کو یکساں کر دیتا ہے۔ جب دو انسانوں کو جو مختلف اور مشترک ملی جلی صفات رکھتے ہیں۔ خیالات اور نظریے بھی کم و بیش رکھتے ہیں۔ مزاج نرم اور سخت بھی رکھتے ہیں۔ محبت کے ربط سے جوڑا جاتا ہے تو دونوں ہستیوں میں مسلسل تغیر کی ایک رو چلنی شروع ہو جاتی ہے جیسے کم و بیش پانی کے برتن باہمی اتصال سے اپنے ذخیرۂ آب میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں ایک گھٹتا ہے ایک بڑھتا ہے یہاں تک کہ برابر ہو کر دونو یکساں ہو جاتے ہیں اسی طرح انسانوں میں بھی جب محبت اور رفاقت کا باہمی رشتہ قائم ہو جاتا ہے تو دونوں میں تغیرات کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ کسی کی کوئی صفت گھٹتی ہے۔ کسی کی کوئی صفت بڑھتی ہے۔ کچھ پرانی عادتیں چھوٹتی ہیں کچھ نئی باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور دونوں کا ہم سمت تغیر انہیں ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیتا ہے۔ اس لئے کامیاب ازدواجی زندگی کے لئے ضروری ہے کہ باہمی تعاون سے ہم سمت تغیر کی طرف قدم بڑھایا جائے اور میرے لئے یہ مسرت کا مقام ہے کہ ہم باہمی تعاون کے ساتھ ہم سمت سفر کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔

اب ربطِ باہمی اور مستقل رفاقت کے رشتہ کو مضبوط تر کرنے کے لیے سخت احتیاط

کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم اگر کسی کتاب سے بھی وابستگی رکھتے اور پسند کرتے ہیں تو اسے احتیاط سے پڑھتے ہیں۔ اس کے ورق نہیں موڑتے، اسے میلا نہیں ہونے دیتے۔ اسے جلد کروا لیتے ہیں۔ اسے محفوظ رکھتے ہیں۔ کسی لاپروا آدمی کو دینا نہیں چاہتے۔ اور ہمیشہ اسے پوری احتیاط اور صفائی سے استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح کی احتیاط ہمیں انسانی تعلق میں بھی ملحوظ رکھنی پڑتی ہے۔ ہم پسند نہیں کرتے کہ ہماری عزیز ہستی کے دل کو کوئی ٹھیس لگے، ڈرتے ہیں کہ کہیں اس کا دل دکھ نہ جائے کہیں وہ برا نہ مان جائے۔ کہیں وہ غمگین نہ ہو جائے۔ کہیں وہ اداس نہ ہو جائے۔ میری کوئی بات اسے بری نہ لگ جائے۔ یہ نہ ہو جائے وہ نہ ہو جائے، اور اس طرح رفاقت و محبت سراسر احتیاط ہی احتیاط ہوتی ہے۔ یعنی محبت کا خمیر خوف سے گوندھا گیا ہے۔ خوف کے بغیر محبت گستاخ ہو جاتی ہے اور محبت کے بغیر خوف مسکینی عاجزی اور بیچارگی پیدا کرتا ہے جو شاہیں مزاج ایمان کے منافی ہے۔ نہ مجرد محبت بلا خوف کوئی حقیقت رکھتی ہے اور نہ ہی مجرد خوف بلا محبت کوئی افادیت رکھتا ہے بلکہ دونوں کا ملا جلا اثر وہ مضبوط کڑی تیار کرتا ہے جو اقرارِ قبولیت اور اس سے عظیم تر اقرارِ شہادت کو سچا کرنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ محبت اور خوف کا یہ ملا جلا فلسفہ ضرور ذہن میں رکھو۔

محبت کے لیے دو مزید اجزا کا ہونا بھی ضروری ہے۔ کشش اور جھجک یا والہانہ لگاؤ اور ادب۔ ان دونوں کا امتزاج جذبۂ احترام پیدا کرتا ہے۔ محبت ہمیشہ احترام کے قابل ہوتی ہے۔ گستاخ تو صرف ہوس ہوتی ہے۔ اسے بڑی آسانی سے اس کی گستاخی سے ہی پہچانا جا سکتا ہے۔ ہوس کی عمر بھادوں کے بادلوں سے بھی کم ہوتی ہے زور شور سے اٹھتی ہے اور معمولی رکاوٹوں اور مزاحمتوں سے گھبرا کر بھاگ جاتی ہے، البتہ

یقین محکم اور فاتح عالم محبت زمین و آسمان کی طرح مضبوط قائم اور مستحکم ہوتی ہے اور احترام و ادب محبت کا سب سے بڑا ستون ہے۔ ہم باہمی اس لیے محبت کرتے ہیں کہ مالک الملک کی عظیم محبت کو پانے کے لئے باہمی تعاون سے زندگی کا سفر صحیح سمت میں طے کریں۔ یہ مشترک سفر ہماری محبت میں پائیداری کا ضامن ہے۔ یہ بات یاد رکھنا اور کبھی نہ بھولنا۔

چند دنوں تک میں تمہارے نام ترجمان القرآن جاری کرا دوں گا بہت بلند پایہ جریدہ ہے۔ سرور کی صحت کا لکھو۔ اس نے اپنے ٹوٹے پھوٹے خط میں صحت کی خرابی کا ذکر کیا تھا۔ انو اور شاکے کو بہت سا پیار۔

نئی دہلی - ۱۶ جولائی ۱۹۷۶ء

---

(۲۴)

انتظار نامہ ملا۔ بے حد ممنون ہوں۔ اس بار بہت انتظار کرایا۔

ایک شوہر نے اپنی بیوی کو لکھا "میں جب سے تم سے جدا ہوا ہوں یہاں پردیس میں آکر میرا عجیب حال ہے۔ ہر وقت تمہارا ہی خیال رہتا ہے۔ تمہاری یاد ذہن میں گونجتی ہے۔ چلتے پھرتے تمہارا نقشہ ذہن میں آتا ہے۔ سوتا ہوں تو تمہارے خواب نظر آتے ہیں" بیوی نے جواب میں لکھا " آپ کہتے ہیں کہ بے حد اداس ہوں اور خواب میں بھی تم ہی نظر آتی ہو۔ تو ماشاءاللہ آپ سوتے بھی ہیں۔ یہاں تو جدائی نے نیند بھی چھین لی ہے۔ پہاڑ جیسی رات ہوتی ہے جس کا ایک سرا ازل سے اور دوسرا ابد سے

ملا ہوا ہوتا ہے کاٹے نہیں کٹتی۔"

بس یہ سمجھو کہ ان دنوں اس قسم کے مضامین پسند آنے لگے ہیں اس لیے جانِ من! ذرا جلد جلد خط لکھتی رہو۔ تم نے کسی کے چڑچڑے پن کا تذکرہ کیا ہے۔ میں خود تو اللہ کا فضل ہے کہ کبھی کسی سے نہیں چڑا کرتا۔ البتہ اگر کوئی چڑے تو اس کے چڑانے میں تو سب کو لطف آتا ہے اس لئے کہ وہ سب کے لئے تفریحِ طبع کا اچھا شکار ہوتا ہے چڑنے والے کو تو لوگ چڑا چڑا کر پاگل کر دیا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ "لال کتاب" میں لکھا ہے کہ جو شخص چڑے اُسے چڑیا کا گوشت کھلانا چاہیئے اور چوں چوں کا مربہ بھی۔ بس اس سے افاقہ ہو جاتا ہے۔

ڈاک نکلنے کا وقت ہو رہا تھا جلدی سے چپراسی کو دوڑایا وہ خدا کا بندہ ناکافی ٹکٹ لگا کر ڈال آیا۔ اب وہ خط بیرنگ ہو کر تمہیں ملا ہو گا۔ بہر حال خط ملنے کا یقین ہو گیا۔ تم بھی اگر کوئی بات ضروری ہو اور عام خط میں گم ہونے کا خطرہ ہو تو بیرنگ ڈالو۔ ملنے کا یقین ہو جاتا ہے۔ آج کل ڈاک کی بدانتظامی نے خطوط کے معاملے میں سخت بے اطمینانی پیدا کر دی ہے۔

تم نے مومن کے مقصدِ زندگی پر پختہ اعتماد اور یقینِ محکم کا اظہار کیا ہے۔ تمہارا یہ جذبہ اور ایمان دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ یقین کے بغیر دنیا کی ہر چیز اپنے مرکز سے ہٹ جاتی ہے۔ یقین کی کمی افراد تو کیا قوموں اور ملکوں تک کو تباہ کر دیتی ہے اور یقینِ محکم بہت سی مادی کمزوریوں اور بے سروسامانیوں کو بھی ڈھانپ لیتا ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ "صبر والے صاحب ایمان مسلمان دس بھی ہوں تو سو کافروں پر بھاری ہوں گے"۔ اس سے یہی مراد ہے کہ مومنین کو اپنے رب کے انعامات پر کامل یقین ہوتا ہے۔ اور

وہ اپنے اصولوں پر زندگی کی بازی لگا دیتے ہیں اس لیے ان کے مقابلے میں بے اصول اور بے مقصد لوگ ٹھہر نہیں سکتے ۔ یقین کے ساتھ کہی ہوئی ایک بات شک کے ساتھ کہے ہوئے لمبے چوڑے وعظ سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ کفار رسول کریمؐ کی باتوں کو سننے سے گریز کرتے تھے ۔ قرآن شریف کی آیتیں سن کر کانوں میں انگلیاں دے لیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ تو جادو ہے جو دلوں میں خواہ مخواہ اترتا چلا جاتا ہے ۔ حق و صداقت کا یہ سب سے موثر حربہ ہے جو مخالفین کو بھی فتح کر لیتا ہے ۔ البتہ دلوں میں بغض و عناد کا روگ ہو تو زبانیں انکار کرتی رہتی ہیں ۔

راہِ حق میں ایثار و قربانی کے لئے تم نے پروانے کی مثال خوب دی ہے ۔ پروانہ ایک حقیر کیڑا ہے لیکن جس چیز سے اسے انس ہے وہ اس کی طرف دیوانہ وار بڑھتا ہے ۔ شمع سے اسے سوائے جلن تپش سوز اور تلخی کے کچھ میسر نہیں آتا لیکن وہ اس تپش اندوزی پر نہ شمع سے روٹھتا ہے، نہ ہی سوز و تپش کے خیال سے ڈرتا ہے اور نہ ہی شمع کے بار بار جلانے پر سٹپٹاتا یا جھنجلاتا یا مایوس ہوتا ہے وہ ہر حال میں اپنی محبت اپنے ذوق اور اپنی وارفتگی کا اظہار کیے جاتا ہے ۔ یہاں تک کہ جل جاتا ہے ۔ حقیر کیڑا ایک فانی روشنی پر تو یوں فدا ہو جاتا ہے لیکن مسلمان جس کے سامنے دینِ حق کی لازوال روشنی موجود ہے وہ اس روشنی کو لے کر دنیا کی تاریکیوں کو روشن کرنے کے لیے آگے بڑھنے سے گھبراتا ہے ۔ آج اس دور میں اس کے پاس اپنے مالک کی راہ میں اسلام کی روشنی پھیلانے کے لئے جلن سہنے والا سینہ نہیں رہ گیا ہے ۔ تپش برداشت کرنے والا مضطرب دل نہیں رہ گیا ہے، زخم کھانے والے بازو نہیں رہ گئے ہیں، مصیبت برداشت کرنے والا حوصلہ نہیں رہ گیا ہے ۔ اسے اللہ کی راہ میں نوکری چھوٹنے یا

چھوڑنے کا ڈر ہے، کاروبار میں خسارے کا ڈر ہے۔ عزیزوں کے روٹھنے کا ڈر ہے۔ بھوک اور تکلیف کا ڈر ہے اور وہ مسلمان جو سب سے پہلے ہر غیر اللہ کے مقابلے میں لاالٰہ الا اللہ کہہ کر اعلانِ بغاوت کرتا ہے اب وہ ہر ہر شے سے ڈرتا ہے۔ پروانے جیسے حقیر کیڑے کو تو اپنے عشق کے اظہار میں سوز و تپش برداشت اور جلنا گوارا ہو اور ثبوت کے لئے وہ خود جل مرے لیکن مسلمان کے زبانی اقرار سے ہی اس کا مالک راضی ہو جائے یہ تو عجیب بات ہے۔ چیونٹی، مچھر، جھینگر اور چمگادڑ کو تو ہم شمع کا عاشق قرار نہ دیں اس لئے کہ وہ اس پر فدا نہیں ہوتے۔ لیکن مسلمان کے سامنے نظامِ حق مغلوب رہے اور وہ اپنے رب کی بجائے طاغوت کی خدمت کرتا رہے تو بھی اس کا مالک اس سے راضی رہے اور وہ سچا مسلمان کہلائے اگر پروانہ بے جلے بے مرے پروانہ نہیں ہے تو پھر مسلمان بھی شمعِ ہدایت پر اپنا سب کچھ قربان کیے بغیر مسلمان نہیں ہے۔ ہم جو مسلمانی کا دعوے کرتے پھرتے ہیں ان دعووں میں صداقت ثابت کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی عملی ثبوت نہیں ہے۔ جب رسول پاکؐ نے اپنی بیٹی سے فرمایا کہ "پیغمبر کی بیٹی ہونے سے تیرا کوئی بچاؤ نہ ہوگا ہر شخص اپنے اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے" تو پھر ہم صرف مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو کر ہی کس طرح ان انعامات کے حقدار ہو سکتے ہیں جن کا وعدہ مومنین سے کیا گیا ہے۔

شمیم اکبر واقعی خوب باتونی ہے۔ انوری سے بھی زیادہ، جو باتیں شروع کرتی ہے تو ختم نہیں کرتی۔ گلابی اردو بولتی ہے۔ چچا جان سے کہا تھا کہ جب گھر کی زبان دوسری ہو تو بچے کو الگ سے ایک اور زبان سکھانا ذرا مشکل ہے اور بچے کے کمزور اور نازک ذہن پر دوہرا بوجھ پڑتا ہے اسے بیک وقت دو زبانیں سیکھنی پڑتی ہیں۔ اس لیے بچے کو اگر کوئی

زبان سکھانی ہو تو گھر کے سارے لوگوں کو وہی زبان بولنی چاہیئے۔
ڈاک کی ہڑتال کا تو خدا ہی حافظ ہے۔ ان دنوں بمبئی اور مدراس کے علاقوں میں بھی ہڑتال کا بہت زور ہے۔ خدا کرے یہ خط تمہیں جلد مل جائے۔
جب تک ہڑتال ختم نہیں ہو جاتی لفافے کے اندر یا باہر اپنا پتہ ضرور لکھتی رہو۔

نئی دہلی ۳ اگست ۴۶ء

---

(۲۵)

آج اتوار ہے۔ صبح مقامی اجتماع میں شامل ہونے کے لئے گیا تھا۔ واپس آتے آتے ایک بج گیا۔ اجتماع سے واپسی پر تمہارا خط ملا۔ تم نے شرم و حیا کے بارے میں دلچسپ باتیں لکھی ہیں۔ شرم و حیا کو تو میں زندگی کا روشن ترین اخلاقی پہلو سمجھتا ہوں۔ جس میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ بے حیائی اور بے شرمی ایک ملمع ہے جسے بہت جلد اتر جانا ہوتا ہے میری نظر میں شرم و حیا کی کمی بیشی انسان کے اخلاق پر روشنی ڈالتی ہے اور شرم و حیا کے دائرے میں کم گوئی اور کم سخنی بھی آتی ہے۔ یہ بات تو مناسب نہیں کہ جان بوجھ کر گم صم رہا جائے۔ یہ تو بناوٹ ہے۔ البتہ فطری طور پر کم گوئی شرم و حیا کی دلیل ہے۔ رسول پاکؐ نے فرمایا ہے کہ حیا ایمان کا جزو ہے۔ اس طرح یہ صرف عورتوں کا ہی حصہ نہیں بلکہ اس کا مردوں میں بھی ہونا ضروری ہے۔ لیکن عورتوں میں حیا کا جس قدر زیادہ جزو ہو اسی قدر وہ اپنے اصل مقام کے نزدیک رہتی ہیں۔ تمہارا یہ خیال ٹھیک ہے کہ شرم و حیا

کو ایک اخلاقی قدر کی حیثیت حاصل ہے۔ اس چیز کے فقدان نے مغربی تہذیب کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے اور اس کا تربیت یافتہ انسان حیوان کے مقام پر جا گرا ہے۔ انسان کی اصل قدر و قیمت اس کی بلند اخلاقی ہے۔ لیکن مغربی تہذیب کے جھوٹے بازار میں اصل تو چھپی رہتی ہے اور نقل کی چمک دمک آنکھوں کو خیرا کرتی رہتی ہے۔

آنسو کی قیمت تم نے پوچھی ہے۔ آنکھ سے نکلے ہوئے آنسو کی قیمت ہمدردی کے دو لفظ ہیں اور دل سے ٹپکے ہوئے آنسو کی قیمت تو پوری کائنات بھی نہیں ہو سکتی۔ اس کی پہنچ تو سیدھی بارگاہِ الہٰی تک ہے۔ دو آنکھیں جن پر دوزخ کی آگ حرام کی گئی ہے ان میں ایک آنکھ وہ ہے جس میں سے اللہ کے ڈر سے آنسو ٹپک پڑتا ہے۔

اللہ سے محبت اور اللہ کے لئے اس کے بندوں سے محبت زندگی کا نہایت سادہ معصوم اور پاکیزہ جذبہ ہے۔ اس میں کوئی بناوٹ نہیں، کوئی تصنع نہیں۔ یہاں تک کہ تکلفات کے چند الفاظ کا بوجھ بھی اس کی سہار سے باہر ہے۔ بناوٹ اور الفاظ کا خول تو چند دنوں کا ہوتا ہے جو جلد اتر جاتا ہے اور اس خول میں کوئی پائیداری نہیں ہوتی۔ یہ راہ پُرخطر اور پُرخار بھی ہے۔ مالک کی راہ میں نیت کا ذرا سا کھوٹ بھی ساری قلعی کھول دیتا ہے اور جب ایک بار قلعی کھلتی ہے تو پھر ہمیشہ کے لئے کھوکھلی محبت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ دل اور زبان کا ایک ہونا محبت کی راہ میں سب سے مضبوط محافظ ہے۔ محبت میں یہ بھی لازمی ہے کہ محبوب کے سامنے دل کی بات اپنے ہی الفاظ میں کہی جائے۔ محبت یہ گوارا نہیں کرتی کہ اسے اپنا مطلب بیان کرنے کے لئے دوسرے کے خیالات یا الفاظ کو مستعار لینا پڑے۔ اسی لیے نماز کے بعد اپنی زبان میں دعا مانگنے میں جو کیفیت سکون اور قلبی اطمینان ہوتا ہے وہ دوسری کسی زبان میں نہیں ہوتا۔

تم نے اپنے غصّے کے جنون کا تذکرہ کیا ہے۔ اللہ رحم فرمائے۔ مومن میں غصّہ نہیں ہوتا۔ وہ خوش ہوتا ہے تو بھی اللہ کی راہ میں کوئی خدمت کر کے، اور ناراض ہوتا ہے تو بھی اللہ کی راہ میں۔ اللہ کی راہ سے ہٹ کر اس کا کوئی جذبہ بھی کام نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کی ساری زندگی کو عبادت کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ اس کی زندگی کا کوئی سانس بھی اللہ کی رضا سے ہٹ کر نہیں ہوتا۔ اور جب تک وہ ہٹا رہتا ہے اس پہ نفسانیت کا دَور دَورہ رہتا ہے۔ "موت کو نزدیک سمجھو" کی حدیث سے یہ مراد ہے کہ ہر وقت اپنے اعمال کا حساب دینے کے لئے تیار رہو۔ جب انسان کو معلوم ہو کہ اب میں سو رہا ہوں تو شاید صبح زندہ نہ جاگوں تو وہ عشا کی نماز بلکہ دن کی نمازوں کا بوجھ سر پر لے کر کبھی نہ سوئے گا۔ دن بھر کی غلطیوں سے زیادہ نیکیاں کرنے کی کوشش کرے گا۔ کسی کا دل دکھانے سے پرہیز کرے گا۔ موت کا ڈر تو نہیں البتہ موت کی یاد سے انسان چوکنا رہتا ہے۔ جس کو آج ہم آسمانوں میں اڑتا ہوا دیکھتے ہیں کل اسے زمین کے تہہ خانوں اور اندھیروں میں چھپا ہوا پاتے ہیں۔ یہ سب آخرت کی یاد کے اشارے ہیں۔ انسان کی ساری دنیاوی ہوسِ مال و دولت، محلات، دنیاوی حالت میں آگے سے آگے بڑھنے کی خواہش یہ سب بے معنی چیزیں پیچھے رہ جانے والی اور انسان کے پاؤں کی زنجیریں ہیں۔ سچے بادشاہ کے لشکر کا بس وہی شہ سوار ہے جو اس کے راستے پر گامزن ہے۔ باقی سب بھٹکے ہوئے راہی ہیں جنہیں اپنی گمراہی کی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھا کھا کر تباہی کی بڑی بڑی غاروں میں بالآخر گر جانا ہے اور یہ غاریں کاروں میں سوار ہونے والوں کو بھی ہڑپ کر جاتی ہیں اور پیدل چلنے والوں کو بھی۔ انجام سب کا ایک ہے۔ پھر یہ غرور یہ لمبے چوڑے خواب اور خواہشوں کے محلات یہ کوتاہ بینی اور کم اندیشی نہیں تو اور کیا ہے۔!

تم نے بہت سی کتابیں پڑھ لی ہیں اب مجھے یقین تھا کہ تم پردہ اور حقوق الزوجین جلد ہی مانگو گی بلکہ تعجب تھا کہ تم نے ان کے لئے اب تک کیوں نہیں لکھا۔ اب مانگ رہی ہو تو ضرور بھیجوں گا۔ تم بھی سوچتی ہو گی کہ میں نے اب تک یہ دونوں کتابیں تمہیں کیوں نہیں ارسال کیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خاص طور پر عورتوں کے مسائل سے ہی بحث نہیں کرتیں، دیگر بہت سے مسائل بھی ہیں جن کا فوری طور پہ جاننا تمہارے لیے ضروری نہ تھا۔ پردے میں مغربی تہذیب کی سیاہ کاریوں کو کھول کر دکھایا گیا ہے کہ کس طرح اس غیر انسانی تہذیب نے پردے سے ہٹ کر انسانی زندگی کے مضبوط ترین ستون عائلی زندگی کو کھیل بنا لیا ہے دوسری طرف پردے کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر ہے۔ مصنف نے پردے کی حمائت کی ہے اور قرآنی آیات سے پردے کی حدود قائم کی ہیں۔ موجودہ حالات میں وہ پردہ کو اور بھی زیادہ سخت اور ضروری سمجھتے ہیں۔ تمہیں اس کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔ ہمیں بھی قرآن کی ہدایات کے مطابق رسمی قسم کی پابندیوں سے ہٹ کر شرعی پابندیوں میں سے گزرنا ہو گا۔ پردہ اور حقوق الزوجین میرے پاس یہاں بھی موجود ہیں۔ حقوق الزوجین میں طلاق، نکاح ثانی، نکاح بیوگان۔ طلاق کے شرعی احکام۔ اسلام میں اخلاق کی اہمیت وغیرہ مضامین پر بحث کی گئی ہے۔ جن کی تمہیں ابھی فوری ضرورت بھی نہیں ہے۔ اصل میں یہ دونوں کتابیں میں نے خود ہی جان بوجھ کر قبل از وقت سمجھ کر تمہیں ارسال نہیں کیں۔ مطالعہ کی بھی ایک ترتیب ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے۔ کہ تم کچھ دن اور رک جاؤ۔ ان کی بجائے میں تمہیں دوسری کتابیں بھیج رہا ہوں۔ خاص طور پر تقویۃ الایمان رسالہ دینیات۔ خطبات اور تعلیمات وغیرہ کو ذرا غور سے پڑھنا۔ تعلیمات کو پڑھنے سے تمہیں پتہ چلے گا کہ موجودہ تعلیم کس قدر بیہودہ اور مسلمان کو نامسلمان بنانے والی ہے۔

اس میں ایک مضمون نیا نظام تعلیم اور دوسرا خطبہ تقسیم اسناد ہے اسے بھی غور سے پڑھنا۔ اور دعوت اسلامی میں عورتوں کا حصہ بھی بہت عمدہ مضمون ہے۔ میری یہاں کی ذاتی کتابیں لائبریری کے طور پر لوگ لے کر پڑھتے رہتے ہیں اس لئے ویسے بھی اس وقت تمہاری دو دو تو مطلوبہ کتب جاری ہیں۔ تم بھی اپنی سہیلیوں میں یہ کتابیں جو تمہارے پاس جمع ہوگئی ہیں مطالعہ کے لئے دیا کرو تو مجھے خوشی ہوگی۔ میرے پاس بہت سے خرافاتی ادبی رسالے اعزازی طور پر آتے ہیں لیکن نہ میں انہیں اب خود پڑھتا ہوں اور نہ تمہیں بھیجنا پسند کرتا ہوں۔ آج کل کے رسالے گندگی کی پوٹ بن کر رہ گئے ہیں۔ ان کے مدیران کرام مجھ سے دیرینہ مراسم کی بنا پر مجھے اب تک بھیجتے رہتے ہیں۔ انہیں ابھی میری تبدیلی کا پورا علم نہیں ہوا ہے۔

یہاں کے کچھ احباب تحریک مل جل کر ایک ماہوار رسالہ جاری کرنے کی تجویز بنا رہے ہیں۔ جس کے لئے فی الحال ضروری معلومات ہی مہیا کی جارہی ہیں۔ اگلے اتوار کو اس پر مکمل بحث ہوگی اور پوری اسکیم پیش کی جائے گی۔ ابھی شروع بھی ہوا تو معمولی انداز میں ہوگا یعنی ضخامت اور گٹ اپ کے لحاظ سے۔ اس لئے کہ ہم لوگوں کی مالی حالت کچھ زیادہ تسلی بخش بھی نہیں ہے ہم خود ہی چند آدمی اسے چلائیں گے۔ مضامین کی بھی دقّت ہوگی اس لئے کہ آجکل جو مضامین اخباروں اور رسالوں میں چھپتے ہیں ویسے مضامین تو اس کے حاشیے پر بھی جگہ نہ پاسکیں گے۔ ہمیں تو نئے راستے نکالنے ہوں گے۔

اب یہاں گرمی بڑھ رہی ہے۔ اور تنہائی کے سبب دن پہاڑ کی طرح طویل محسوس ہونے ہیں۔ دعا کرو کہ اللہ تعالےٰ ہمیں اپنی ہی راہ میں زندہ رکھے۔ اپنی ہی راہ میں مارے اور اپنی ہی راہ میں جینے اور مرنے کا حقیقی سلیقہ سکھا دے۔ اس مقصد عظیم کے

سوا باقی سب باتیں تو صابن کے بلبلے ہیں آنکھ جھپکنے میں بیسیوں ٹوٹتے ہیں اور بیسیوں بنتے ہیں۔ اچھا اب بات ختم کرتا ہوں۔

نئی دہلی - ۱۰ اگست ۴۶ء

---

(۲۶)

—— عجیب ہو تم بھی، اپنی اداسی کا ذکر کر کے مجھے سٹپٹا دیا ہے۔ آج دفتر سے جلد چلا آیا تھا۔ تمہیں کل ہی ایک طویل خط لکھا ہے۔ طویل صفحات کے لحاظ سے تھا ورنہ باتوں کے لحاظ سے تو میرے دل کا ایک کونہ بھی خالی نہ ہوا تھا۔ جب خط لکھ کر بھیجتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ بہت کچھ لکھ دیا، لیکن دوسرے ہی لمحے دل و دماغ تمہارے لئے باتوں سے بھر جاتے ہیں۔ رات کافی دیر تک یونہی نماز عشاء کے بعد لیٹ کر سوچتا رہا۔ ایک اداسی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اچانک دفتر کا ایک چپراسی آ کر خط دے گیا یہ تمہارا خط آیا تھا جس میں تم نے اپنی اداسی کا ذکر کیا ہے۔ ابھی کچھ دن ہماری ابتدائی جد و جہد کے باقی ہیں اس لیے ہمت سے کام لو۔ تمہاری اداسی تو میرے سفر کو بوجھل بنا دے گی۔

ایک بہادر اور دل گردے والی رفیقِ زندگی بنو۔ ایک مومن لڑکی جس کی خوشی اور رنج مسرت اور غم سب کچھ اللہ ہی کی راہ میں نچھاور ہوتا ہے۔ تمہاری بزرگ ماؤں نے کربلا میں سختیاں برداشت کیں بھوک پیاس کا سامنا کیا۔ دکھ درد اور غم سہے۔ اپنے عزیزوں اور بچوں کو اللہ کی راہ میں اپنی آنکھوں کے سامنے شہید ہوتے دیکھا اور پھر بھی راضی برضا رہیں۔ خولہ بنت ازور

جو جنگوں میں لڑتی اور سختیاں سہتی رہیں۔ فاطمہ جو طرابلس کی جنگ میں زخمیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی۔ فاطمہؓ بتول بنت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم جو اپنے ہاتھوں سے چکی پیستی اور پانی ڈھوتی تھیں۔ جن کے شوہر میدان جہاد کے مجاہد تھے۔ یہ سب تمہارے سامنے درخشندہ مثالیں ہیں۔ ایک مسلمان مجاہد کو اس کی ماں جہاد پر بھیجتی ہے اور دشمن اسے شہید کر کے درخت سے لٹکا دیتے ہیں۔ مومن ماں چیختی اور سر نہیں پیٹتی، بلکہ کہتی ہے کہ "اسلام کی راہ کا یہ سوار اب تک گھوڑے سے نہیں اترا" جنگ احد میں مسلمانوں کو فتح کے بعد شکست ہو گئی تو ایک مومن عورت جس نے اپنے چاروں لڑکے اور شوہر جنگ میں بھیجے ہوئے تھے ہر آنے والے سے رسول پاکؐ کی خیریت طلب کرتی تھی۔ کسی نے بتایا تیرا لڑکا شہید ہو گیا کسی نے کہا تیرا شوہر شہید ہوا۔ لیکن وہ بار بار رسول اکرمؐ کی خیریت ہی پوچھے جاتی تھی اور جب تک رسول پاکؐ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں لیا اسے چین نہ آیا۔ اسلام کو ایسی عورتوں کی ضرورت ہے جو اللہ کی راہ میں سختیاں سہہ سکیں۔ مردوں کے دوش بدوش۔ اگر گاڑی کا پہیہ معطل رہے گا تو یہ گاڑی کبھی نہ چلے گی۔ کسی منزل تک نہ پہنچ سکے گی۔ شوہروں سے ملیں تو بھی اس احساس کے ساتھ کہ خدا نے ہمیں اپنی راہ میں ایک دوسرے کا ساتھی بنایا ہے۔ جدا ہوں تو بھی اس احساس کے ساتھ کہ رضائے الٰہی یہی ہے۔ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ اُداسی اور غم کا علاج یادِ الٰہی ہے۔ دل اداس ہو قرآن مجید با ترجمہ لے کر بیٹھ جاؤ، دل لگا کر آہستہ آہستہ پڑھو۔ یا ٹھہر ٹھہر کر نماز پڑھنے لگو ساری اداسی اور افسردگی کافور ہو جائے گی۔ اس لیے کہ جب بندہ اپنے خدا کی حضوری میں داخل ہو جاتا ہے تو دنیا کی ساری الجھنیں اس کا پیچھا چھوڑ کر واپس پلٹ جاتی ہیں۔ الجھنیں اور پریشانیاں ہوتی ہی اس لیے ہیں کہ انسان نے اپنے اصلی رب اور معبود کو چھوڑ کر اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشوں

ضروریوں رسموں رواجوں یا لوگوں کو اپنا رب اور معبود بنایا ہوتا ہے اس طرح اس کی حالت بھی وہی بن جاتی ہے جو بہت سے آقاؤں والے ایک غلام کی ہوتی ہے۔ بہت سے آقاؤں والے غلام کو سکون کہاں ملے گا ؟

عورتوں میں تبلیغ کے متعلق تم نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔ اس راستے میں ایسی ہی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ مردوں کا بھی یہی حال ہے۔ کسی کو فلموں یا ناولوں کی کتابیں چاہئیں، کوئی افسانوں کے پیچھے دوڑتا ہے۔ لیکن اس سے ایک مومن کو جو تبلیغ کا فرض ادا کر رہا ہے۔ گھبرانا نہیں چاہیے یہ کبھی نہیں ہوگا کہ سچ بات کہنے والے اور حق کی دعوت دینے والے نے دعوت دی اور ایک بھیڑ کی بھیڑ اس کے پیچھے چلنے لگی۔ جس طرح بہت سے دہی کو بلوتے ہیں تو اس میں سے تھوڑا سا مکھن نکل آتا ہے اسی طرح جب حق کی دعوت دینے والا حق کی دعوت دیتا ہے اور ساری سوسائٹی کو کھنگالتا ہے تو کچھ صالح فطرت انسان اس کی طرف کھنچ کر آتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو "سوسائٹی کا مکھن" کہا جاسکتا ہے۔ رسول پاکؐ کی مکی زندگی کے پہلے تیرہ سال پتھروں زخموں مصیبتوں اور سختیوں کے تھے۔ جس نے بھی کبھی حق کی دعوت دی ہے اس کا ہمیشہ یہی حال کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں انسانیت کی تاریخ کی جھلکیاں دیکھو کہ پیغمبروں کے ساتھ ان کی قوموں نے کیا کچھ کیا۔ لیکن ان کے مقابلے میں پیغمبروں کا حال دیکھو کہ انہوں نے اپنی قوموں کو ہمیشہ سمجھایا ان سے نرمی برتی اور ان کے لیے دعائیں کیں، اس لیے گھبراؤ نہیں۔ اگر ایک مومن اپنی پوری زندگی میں کسی ایک بھٹکے ہوئے انسان کو بھی راہ راست پر لے آئے تو اس نے بہت بڑا کام کیا۔ حق کی راہ میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اس نے دعوت قبول کرنے والوں کی کتنی لمبی فہرست تیار کر لی ہے بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ داعی کا جذبہ خلوص محنت اور حق کی راہ میں اس کی کوششیں کتنی ہیں۔ حضرت نوحؑ

سینکڑوں برسوں میں تھوڑے سے لوگوں کو مسلمان بنا سکے۔ حضرت لوطؑ حضرت ابراہیمؑ کا بھی یہی حال رہا۔ حضرت عیسیٰؑ صرف ۱۱ آدمیوں کو مسلمان کر سکے ' ہدایت دینا یا نہ دینا یہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔ مومن کا کام سعی کرنا، کوشش کرنا اور اپنا آرام اللہ کی راہ میں نچھاور کرنا ہے ۔ عورتیں تو بالعموم زیورات اور کپڑوں کی باتیں ہی پسند کرتی ہیں یہ تم نے ٹھیک کہا۔ یونہی ہوا کرتا ہے آج کل کی عورتوں کی ایک تعداد نے اپنی قیمت زیورات اور کپڑوں کو ہی سمجھ لیا ہے ۔ کسی بالاتر ہستی یا نصب العین کو وہ نہیں سمجھتیں ۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور کی عورت نے اپنا بلند مقام کھو کر ذلت کا وہ پست درجہ پا لیا ہے جس پر وہ کبھی زمانۂ جاہلیت میں بھی نہ تھی۔ عورت کے لئے یہ بات کچھ کم قابل فخر نہیں ہے کہ وہ اپنے شوہر کی حقیقی پُر محبت اور فرمانبردار ساتھی ہے ۔ شرم و حیا کی مالک ہے ۔ عصمت و عفت کی ملکہ ہے ۔ گھر میں ایک مخصوص پاکیزہ ذہنی فضا قائم رکھنے کی ذمہ دار ہے ۔ جن خواتین نے مردوں کی طرح پتلونیں اور نکریں پہننا ' کلبوں میں جانا سیر و تفریح کے لیے تنہا پھرنا، فلمیں دیکھنا اور کھلے منہ بے حیائی کی باتیں اور حرکتیں کرنا سیکھ لیا ہے ۔ انہوں نے دراصل مردوں کی گھٹیا تفریح کے لئے اپنے آپ کو خود ذلیل کر لیا ہے

جب کوئی تم سے کپڑوں اور زیورات کی باتیں کرے تو تم اس کے سامنے زندگی کا اسلامی نقطہ نظر ضرور واضح کرو، تم دیکھو گی کہ وہ جھینپ کر اپنا موضوع چھوڑ دے گی۔ تم کسی کے خالص مادی نقطہ نظر کے مقابلے میں جب اپنا اخلاقی اور اسلامی نقطہ نظر بیان کرو گی تو وہ ایسی باتیں آہستہ آہستہ کم از کم تمہارے سامنے کرنا چھوڑ دیں گی اور ہو سکتا ہے کہ متاثر ہو کر بالکل ہی چھوڑ دیں ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں تمہارا مذاق بھی اڑایا جائے گا۔ ''بی جمن'' اور ''بی نمازن'' کی قسم کے جملوں سے تمہیں چڑایا بھی جا

سکتا ہے۔ لیکن یوں تو ہر مومن کی ایک آزمائش ہوتی ہے جس میں سے اسے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ جو اس ابتدائی آزمائش میں سے بھی نہ گزر سکا وہ آگے کے بڑے بڑے مرحلوں میں کیا کرے گا۔ جب تم اپنی طبیعت کی یہی نہج بنا لو گی کہ ہر برائی سے عدم تعاون اور ہر اچھائی میں شمولیت، تو بتدریج تمہاری سہیلیوں اور ملنے والی خواتین میں سے صرف وہی تمہارے گرد رہ جائیں گی جن میں قبولِ حق کی صلاحیت ہو گی باقی سارا کوڑا کرکٹ چھٹ جائے گا اور تم اطمینان سے یہ کہہ سکو گی کہ خس کم جہاں پاک۔

مسرت کی بات ہے کہ تمہارا مطالعہ مسلسل جاری ہے۔ اس مختصر سی زندگی میں ہمارے پاس اتنی فرصت ہی کہاں ہے کہ ہم دوسری خرافات میں الجھ سکیں۔ ایک مختصر سا وقفۂ حیات ہے اور کام پہاڑ سے بھی بڑا سامنے پڑا ہے۔ اس کام کو دیکھ کر بڑے بڑے بہادروں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے اور وہ فرار ہونے کے راستے ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ اولاد پہ ماں کا حق اسی لیے تو بڑا ہے کہ وہ اپنی اولاد کے لیے بے انتہا مصیبت برداشت کرتی ہے۔ امی جان کی غیر موجودگی نے تمہیں ان کی صحیح قدر دلائی ہے۔ ماں دنیا میں اللہ کی دی ہوئی نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت ہے جو اپنے بچے سے بے غرض اور بے لوث محبت کرتی ہے اور بچہ اگر اسے دکھ بھی دے اور دکھ تو وہ دیتا ہی ہے تو بھی وہ اس کے لئے دعائے خیر ہی کرتی ہے۔ تم تھوڑی سی توجہ اپنی چھوٹی بہنوں پر بھی دیتی رہو۔ مغرب کے بعد انہیں تھوڑا سا پڑھانا بہت مفید ہو گا۔ تمہاری تفریح اور ان کا کام۔ تمہاری توجہ سے انہیں بہت سی دین کی باتیں بھی معلوم ہو جائیں گی۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ جہاں دو انسان ہوتے ہیں ان دو میں تیسرا میں ہوتا ہوں اور جہاں تین ہوتے ہیں ان میں چوتھا میں ہوتا ہوں۔ یعنی اللہ پاک ہر جگہ ہر وقت حاضر و ناظر

ہے۔ وہ اپنے بندوں کا محافظ و نگران ہے۔ ہر بندے کا رات کی تاریکیوں میں دن کی روشنیوں میں کیا ہوا ظاہر و باطن کام قیامت کے روز اس کے سامنے پیش کر دے گا۔ اس لئے اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرو اور اسی کے حکم کے ماتحت، جس سے ڈرنے کا حکم دیا گیا ہے اس سے ڈرو اور اس بات سے بھی ڈرو کہ قیامت میں رسوائی نہ ہو۔ جس طرح چند گھنٹے کے امتحان کے کمرے میں غفلت کا نتیجہ سارا سال بھگتنا پڑتا ہے اسی طرح اس دنیا کی چھوٹی سی زندگی کی غفلت کا نتیجہ بھی ابدی خسارے کی صورت میں بھگتنا ہو گا۔ اللہ تعالےٰ ہر مومن کو اپنے غضب اور ناراضگی سے بچائے۔ آمین۔

تم نے اپنے آپ میں تبدیلیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ٹھیک کہتی ہو۔ دعوتِ حق قبول کرنے کے بعد آدمی میں بڑی تبدیلی آتی ہے۔ میں خود اپنے آپ کو دیکھتا ہوں کہ میری دعائیں بدل گئی ہیں میرا ذہن بدل گیا ہے۔ دل و دماغ میں سے بہت سے بت خارج ہو گئے ہیں۔ البتہ میری ڈائری میں گزشتہ سال کا لکھا ہوا یہ شعرِ اقبال اب بھی موجود ہے اور دل کو لبھا رہا ہے۔

محبت چیست تاثیرِ نگاہیست ۔۔۔ چہ شیریں زخمے از تیرِ نگاہیست
بصیدِ دل روی؟ ترکش بیندازہ ۔۔۔ کہ ایں نخچیر، نخچیرِ نگاہیست

نئی دہلی۔ ۱۱ اگست ۱۹۴۶ء

۲۷

دیکھو تازہ کوثر میں تمہارے حج والے سوال کا جواب آگیا ہے۔ جواب بہت مختصر مگر جامع ہے۔

مجھے مسرت ہوئی کہ تم پوری تندہی اور غور و فکر سے اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کر رہی ہو۔ اسلام کا مطالعہ ہی حقیقی علم ہے۔ ورنہ اس سے علیحدہ تعلیم تو تجربۂ بے ثمر ہے۔ کئی دفعہ سوچتا ہوں کہ اسلام سے بے بہرہ رہ کر میرے بہت سے تعلیمی سال ضائع ہو گئے ہیں۔ اس تمام عرصے میں ہم باطل نظام کی مشینری کا کارآمد پرزہ بننے کے سوا اور کچھ نہ سیکھتے رہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اب بھی ہدایت کا راستہ دکھا دیا ہے ورنہ ہم تو سینکڑوں اور ہزاروں کو دیکھتے ہیں کہ مسلمان کہلاتے پھرتے ہیں اور قطعی اسلام کے خلاف حرکتیں کرتے ہیں۔ ہر قسم کے شرک اور کفر اور نفاق کے پیوند اسلام کے ساتھ لگا لگا کر اسے مسخ کرتے ہیں۔ نظامِ باطل کی خدمت کرتے ہوئے ان کے دل میں کوئی خلش تک نہیں ہوتی اور ان کے ضمیر میں کانٹا تک نہیں چبھتا۔ وہ اس زندگی پر مطمئن ہیں جو نظامِ باطل نے ان کے لئے وضع کر کے انہیں دے دی ہے۔ میں تمہارے سینے میں اسلامی تعلیمات کی تڑپ دیکھتا ہوں تو دل مسرت سے جھوم جاتا ہے۔ معاشرے میں موجودہ تصنعات اور تکلفات کے بارے میں تم نے تحریر کیا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ مغربی تہذیب کی پیدا کردہ یہ بھی ایک برائی ہے جسے ختم کرنے کی کوشش ہونی چاہیئے یہ چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانے والی اور دکھاوے والی بات ہے جو تجارت

میں بلیک مارکیٹ اور مہنگائی کا موجب بنتی ہے اور معاشرہ میں رشوت کا چسکا لگاتی ہے ۔ اس بیماری کی ضرور ہی مذمت کرنی چاہیئے اور حق بات کہنے میں آداب کے سوا کسی مصلحت کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے ورنہ آدمی میں برائی کو برداشت کرنے کی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے ۔

آجکل ہماری مسلم سوسائٹی اور ماحول اسلام کی فضا سے اتنی دور جا پڑے ہیں کہ ان میں رہ کر ان کے حالات سے مصالحت کر کے انسان اپنی صحیح اسلامی روح کو قائم تک نہیں رکھ سکتا ۔ آج کل تو یہ حال ہے کہ جو شخص اسلام کی دل سے پیروی کرنا چاہتے وہ اپنے ماحول اور اپنوں ہی کے درمیان اجنبی بن کر رہ جاتا ہے ۔ مومن کو تو برائی اپنوں کی بھی اور اپنی بھی کھٹکنی چاہیئے ۔ اور اچھائی دوسروں کی بھی اور دشمنوں کی بھی بھلی معلوم ہونی چاہیے ۔ اچھائی کا معیار کیا ہے ۔ میرے خیال میں اچھائی وہ ہے جو اللہ اور رسول ؐ کے حکم کے مطابق ہو اور برائی وہ ہے جو ان کے احکام کے خلاف ہو ۔

نقل اور اصل کی بات بھی تم نے خوب کہی ہے ۔ نقل ملمع سازی ہے اور اصل حقیقت ۔ نقل آزمائشوں کی ہلکی سی آنچ سے اپنی ملمع سازی کھو دیتا ہے اور اصل جتنا تپایا جاتا ہے زیادہ کھرا ہو ہو کر نکلتا ہے ۔ یہی حق اور باطل کا فرق ہے ۔

اگر تم صرف اسلامی پردے کے حقیقی احکام ہی معلوم کرنا چاہتی ہو تو اسی ام الکتاب میں سے دیکھو جو سب کتابوں کی ماں ہے ۔ قرآن مجید کے اٹھارویں پارے میں سورۂ "النور" نکال کر با ترجمہ غور سے پڑھ لو اور ساتھ ساتھ حاشیے پر دی ہوئی تفسیر بھی دیکھ لو ۔ پردے کے سارے احکام تمہیں وہاں مل جائیں گے پھر اکیسویں پارے میں سورۂ "الاحزاب" ہے اسے بھی غور سے پڑھ لو اس میں بھی پردے کے احکام دیئے

گئے ہیں۔ بس ان دونوں سورتوں کو پڑھنے سے ہی پردے کے احکام تم پر واضح ہو جائیں گے۔ پردے کے متعلق چھوٹی سی کسوٹی تو یہ ہے کہ ہر غیر محرم سے پردہ کیا جانا چاہیئے اور غیر محرم کی صف میں باپ بھائی خسر شوہر بھتیجہ بھانجا بیٹا نہیں آتے ہیں باقی سب آجاتے ہیں۔ تم ان احکام کو پہلے مجمل طور پر قرآن میں دیکھ لو پھر تشریح اور تفسیر کے ساتھ مولانا کی کتاب پردے میں بھی دیکھ لینا۔

ایک عجیب بات سنو۔ رات میں نے مرحوم چچا جان کو خواب میں دیکھا۔ خواب میں خدا جانے وہ کون سی جگہ تھی اور ہم کہاں تھے۔ خواب میں نہ مجھے اس شہر میں ہونے کا احساس تھا اور نہ یہ احساس کہ وہ فوت ہو چکے ہیں۔ تیز بارش ہو رہی تھی اور ہم ایک خیمے میں بیٹھے تھے جہاں بارش کی بوچھاڑ ہمیں مسلسل بھگو رہی تھی اور ہم سمٹ سمٹ کر ایک کونے کی طرف ہو رہے تھے۔ وہ مختلف موضوعات پر باتیں کرتے اور ہنستے رہے۔ اپنی عام عادت کے مطابق مجھے وہ بہت خوش نظر آئے۔ انہوں نے افسانوں کا ذکر کیا تو میں نے کہا کہ عام روش سے بیزار ہو کر میں نے تو لکھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ غرض ہم بہت دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے اور بارش برستی رہی، پھر بارش رکنے کے بعد ہم ایک ویران سی جگہ میں جہاں بہت اونچ نیچ اور جھاڑیاں تھیں، ٹہلتے رہے۔ پھر اچانک یونہی میں نے پوچھ لیا کہ آپ مجھے جانتے ہیں تو کہنے لگے ارے بھائی انہوں کو کون نہیں جانتا ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی اور عزیز ہے پھر خدا جانے وہ کیسے اور کیونکر اچانک رخصت ہو گئے۔

اس خواب کی میرے ذہن میں جو فوری وجہ آئی وہ یہ ہے کہ میں نے کل ہی صبح قرآن پاک پڑھ کر ان کی روح کو ایصال ثواب کیا تھا اور اسی کو میں مرنے والے

اور جینے والے کے درمیان آخری رابطہ سمجھتا ہوں - قرآن پاک بخشنے کی وجہ سے میرے ذہن میں ان کا خیال رہ گیا ہوگا جو خواب کی صورت میں آ گیا. البتہ اس سے مجھے یہ احساس شدت سے پیدا ہوا کہ ہمیں نفلی عبادت میں ان کو ایصال ثواب کا اہتمام کرنا چاہیئے. ممکن ہے انہیں اس کی خاص ضرورت ہو- آخرت میں ان کے نام ہمارا یہی ہدیہ ہے جو انہیں پہنچ سکتا ہے - اب ان کا وہی عزیز ہے جو انہیں اس رنگ میں یاد رکھے ورنہ مادی آسائشوں کی محبت تو ایک بلبلہ ہے - آج کل تو لوگ مقصد اور روح کی محبت سے زیادہ زر و مال کی محبت رکھتے ہیں - آج ہم اپنے سے پہلے مرنے والوں کو یاد کریں گے تو کل ہمارے بعد ہمیں بھی کوئی یاد کرے گا. نیکی کا وہ ہدیہ بھجوائے گا جس کی شاید معمولی رتی کے بھی ہم دنیا کے سونے کے پہاڑوں سے زیادہ وہاں محتاج ہوں گے -

مرنے والے کی قبر پختہ کرنے کا پروگرام بے معنی اور نامناسب ہے. اس کے متعلق تمہاری بات مجھے پسند آئی کہ یہ دنیا بڑے دکھاوے کی دنیا ہے - اسلام میں قبر کا پختہ کرنا منع ہے جو مٹی سے آئے ہوں انہیں مٹی میں ہی ملنا ہے اور جب سب کو مٹی میں ہی جانا ہے تو پھر دنیاوی امتیازات اور دنیوی دولت کے مظاہرے وہاں پرکاہ کے برابر بھی وزن نہیں رکھتے، بلکہ الٹا وزن رکھتے ہیں - مرنے والے کو قبر کی پختگی یا ناپختگی سے کیا تعلق ہے - زمین نے اپنا حصہ واپس لے لیا ہے اور روح مٹی کا جامہ اتار کر عالم ارواح میں چلی گئی ہے - مٹی کے اس ڈھیر کو اگر سونے کے پترے سے بھی منڈھ دیا جائے تو بھی حقیقت تو نہ بدل جائے گی - جو قبر کی پختگی پر خرچ کرنا ہو وہ غرباء پر خرچ کیا جا سکتا ہے. خدا جانے دل کب بدلیں گے اور دماغ کب صحیح سوچیں

گے۔ بس اللہ ہی ہے جس کے ہاتھ میں ہدایت اور ضلالت کا راز ہے وہ جسے چاہے راہ ہدایت دکھائے اور جسے نہ چاہے نہ دکھائے۔ لیکن ان باتوں کو سن کر اور دیکھ کر دل دکھتا ہے۔ دنیا نے محبت کو بناوٹ تصنع اور دکھاوا سمجھ لیا ہے لوگ مادے کی طرف دوڑتے ہیں اور روح کو بھول جاتے ہیں۔ لفافے کی طرف جھپٹتے ہیں اور جو اس کے اندر پیغام پوشیدہ ہے اس کی پروا تک نہیں کرتے۔ اللہ ہم سب پر رحم فرمائے۔

خود پرستی تو ایمان کی ساری روح کھینچ کر لے جاتی ہے۔ اور مسلمان کا شیوہ صرف خدا پرستی ہے۔ باقی ساری قسم کی پرستشوں سے وہ لاالہ الا اللہ کہہ کر علیحدہ ہو جاتا ہے۔ لیکن ان دنوں وہ خدا فروشی اور خود پرستی میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنی راہ میں ہی موت دے جو اللہ کی بجائے کسی دوسری راہ میں مرا وہ آخر کس منہ سے اللہ کے سامنے پیش ہوگا۔ جہاں پیش ہوئے بغیر چارہ بھی نہیں ہے۔

کل یہاں تھوڑی سی بارش ہوگئی اور موسم غنیمت ہے۔ کل تک کچھ بہتر رہے گا پھر وہی گرمی ہوگی۔ سلمیٰ۔ سرور۔ انو۔ شاکا اور آصف کو پیار حالانکہ وہ پیار ان تک پہنچے گا نہیں۔ میں جانتا ہوں۔

نئی دہلی - ۱۵ اگست ۴۶ء

۲۸

ابھی ابھی تمہارے دو خطوط ملے۔ ممنون ہوں اس دلنوازی کا۔

تمہارے خطوط میں ایک چیز اب بہت نمایاں نظر آنے لگی ہے۔ اور وہ زندگی کے معاملے میں تمہارا اسلامی نقطہ نظر ہے۔ جب تک زندگی کے ہر ہر معاملے میں، ایک ایک سانس حرکت اور تا نیے میں، بات چیت کے ایک ایک لمحے میں ہم اسلامی نقطہ نظر کو سامنے نہیں لا سکتے اس وقت تک ہمارا ایمان نامکمل ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ بڑے بڑے شرع کے پابند مسلمان اپنے بعض معاملات کو اسلامی انداز میں انجام دیتے ہیں اور بعض کو دنیاوی لحاظ سے۔ گویا انہوں نے دین اور دنیا کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ دنیا کے معاملے میں جو فائدہ نظر آیا بے دریغ قبول کر لیا، چاہے وہ حرام ہی ہو اور دین کے معاملے میں اس کے مطابق کر لیا۔ گویا مذہبی معاملات میں تو اللہ پاک ان کا خدا ہے اور دنیا کے معاملات میں نعوذ باللہ وہ ان کا خدا نہیں ہے۔ اگر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم فلاں وقت خدا کے بندے ہیں اور فلاں وقت خدا کے بندے نہیں ہیں تو ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ زندگی کے ایک معاملے میں خدا کا حکم مانیں اور دوسرے معاملے میں کبھی رسم و رواج کا، کبھی سوسائٹی کا، کبھی بزرگوں اور خاندان کا اور کبھی اپنے نفس کا حکم مانیں۔ ہمیں ہر رنگ ہر وقت اور ہر معاملے میں اسی خدا کا حکم ماننا ہوگا جو ہمیں زندگی کے چوبیسوں گھنٹوں میں زندگی کے سارے سامان مہیا کرتا ہے۔

چہلم کے متعلق تمہارے خیالات ٹھیک ہیں۔ ایسی رسوم کے لیے اسلام میں کوئی دلیل

نہیں ہے۔ بس اتنا کافی ہے کہ قرآن پاک پڑھ کر مرحوم کی روح کو ایصال ثواب کیا جائے اور مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے۔ اس وقت ہمارے مسلمان گھروں کا ماحول بہت بگڑ گیا ہے اور اس ماحول کو سدھارنے کے لیے بڑی جد و جہد کی ضرورت ہوگی ظاہر ہے کہ اصلاح کے اس کام کے لئے آسمان سے فرشتے نہ اتریں گے بلکہ یہ ہمارا ہی فرض ہے کہ انہیں سیدھے راستے پر لگائیں اور ان کی سب عینکیں توڑ کر صرف ایک اسلامی عینک لگائیں جس سے وہ زندگی کے سارے معاملات کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھ اور پرکھ سکیں۔ رسول پاکؐ نے یہ کارنامہ ۲۳ سال کی مدت میں مکمل کر کے دکھا دیا تھا۔ ہمارا بگاڑ کفر کا نہیں نفاق کا بگاڑ ہے اس میں زیادہ دیر لگے گی پھر بھی اگر حضورؐ کے نقش قدم پر چلیں تو انشاء اللہ ایک دن آئے گا جب اسلام کی طرف سے اندھی آنکھیں کھلیں گی۔ بہرے کان سنیں گے اور پتھر دل بھی اللہ کے نام سے لرزیں گے۔ اس جد و جہد میں ہماری ہمتیں جتنی بلند، ہمارے حوصلے جتنے مضبوط، اور ہمارے ارادے جتنے پختہ ہوں گے ہمارے ایمان اتنے ہی اعلیٰ اور ہماری صبر کی قوت اتنی ہی پائیدار ہوگی اور ہم رسول پاکؐ کے قدم بقدم چلنے میں اتنے ہی کامیاب ہوں گے پھر انشاءاللہ ایک دن تم دیکھو گی کہ مسلمان پھر دنیا میں سربلند ہوں گے اور میرے نزدیک مومن کی سربلندی یہی ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں چلتا رہے چلتا رہے اسی راہ میں زندہ رہے۔ اسی راہ میں جان دے۔ اس جد و جہد میں مومن کے لئے بادشاہی مملکت اور حصول دولت کا کوئی سوال نہیں ہے۔ وہ درویشی میں بھی شاہی کرتا ہے اگر اس میں خودداری ہے، اور کافر شاہی میں بھی غلامی اور ذلت میں مبتلا ہوتا ہے اس لیے کہ وہ اپنے اصلی مالک کا باغی اور غدار ہوتا ہے۔

میری طرف سے سرور کا شکریہ ادا کرنا کہ وہ میرے نام تمہارے خطوط ڈاک میں

ڈالنے کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ آؤں گا تو اس کے لیے چیچی لاؤں گا اور بہت سا پیار بھی۔

میرا خیال ہے کہ مرنے والے کا خواب میں ملنا ایصال ثواب کے لیے ہی ہوتا ہے۔ اس لئے مرنے والے کے لیے دعائے مغفرت ضرور کرنی چاہیئے۔

"محبت کی شادی" کے بارے میں میرا خیال ہے کہ حدود کے اندر رہو تو ٹھیک اور مناسب ہے ورنہ غیر مناسب ہے۔ دل میں کسی تمنا کا ہونا یا اس تمنا کو پورا کرنے کے لیے کھلا کھلا نکاح کا راستہ اختیار کرنا تو معقول بات ہے۔ لیکن چوری چھپے کی بات چیت یا ملاقات کو قرآن حکیم میں اللہ پاک نے سختی سے روکا اور اسے سخت سزا کا موجب ٹھہرایا ہے۔ اس لیے محبت کی شادی جو دل کی حالت تک ہی محدود ہو وہی درست ہے لیکن شادی سے پہلے ملاقاتیں تک کر لینا یورپ کی مکروہ کورٹ شپ ہے جس کے لئے اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ جب تمہاری چوٹی میں کوئی تنکا نہیں ہے تو تمہیں کھٹک کس بات کی ہے۔

نئی دہلی۔ ۲۰ اگست ۷۶ء

---

(۲۹)

چند کتابچے بھیج رہا ہوں۔ گرمیوں کے ان دنوں میں مطالعے کا یہ راشن اچھا رہے گا۔ تم انہیں پسند کرو گی۔ میں نے سب پر نمبر لگا دیئے ہیں تاکہ مطالعہ کی ترتیب قائم کی جا سکے۔

اس طرح مطالعے کی ترتیب لگانے میں سہولت رہے گی اور میرا مشورہ بھی شامل ہوگا۔ اگرچہ تمہاری پسند ہی اصل ترتیب بنے گی۔

ان کتابچوں میں سے چند ایک بازار سے نہ مل سکے۔ چنانچہ اپنے قائم کردہ دارالمطالعے میں سے ہی بھیج رہا ہوں پھر خرید کر دارالمطالعے میں شامل کر لوں گا۔

ان کتابچوں میں "ایک" اہم استفتا ذرا غور سے دیکھنا۔ عجیب نقطۂ نظر ہے۔ جو لوگ غیر الٰہی نظام کی جھوٹی اور باغی عدالتوں میں جا کر اپنے معاشرتی معاملات کے فیصلے کراتے ہیں اسلام کی نظر میں ان کی کیا حقیقت ہے اس کتابچے میں اس کی پوری تصویر موجود ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم ان پمفلٹوں کو اپنے لئے بھی اور تبلیغ حق کے لئے بھی کافی مفید پاؤ گی۔

چچا جان کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ بڑے گھر والوں کے ہاں اسلامی تعلیمات کا کچھ زیادہ چرچا نہیں ہے۔ وہاں چونکہ تمہاری رسائی اور پہنچ ہے اس لیے تمہیں چاہیئے کم از کم انہیں نماز کی طرف تو ضرور مائل کرو۔ ذرا حکمت کے ساتھ۔ اور سب سے بڑی حکمت اپنا اچھا نمونہ ہے۔

نماز بھی عجیب چیز ہے۔ بندہ اپنے خدا کے ساتھ کیا کیا عہد کرتا ہے۔ جب وہ پانچ وقت اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِین کہتا ہے تو صاف صاف اقرار کرتا ہے کہ مالک ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں' پھر بھی اگر ہم بار بار باندھے ہوئے اقرار کو توڑ کر غیروں کے سہارے پر امیدوں کے محل بنائیں اور دوسروں سے مدد چاہیں اور ان کی ناراضگی سے خوف زدہ ہوں تو یہ کھلی ہوئی عہد شکنی ہے۔

اس وقت تین بج رہے ہیں۔ اگست کے اس تیسرے عشرے میں بے پناہ گرمی

ہو رہی ہے حبس بے پناہ ہے پنکھا بھی چل رہا ہے اور پسینہ بھی ٹپک رہا ہے ۔ صد حیف! ان بجلی کے پنکھوں میں نہ خلوص ہوتا ہے اور نہ محبت اور پیار کا جذبہ اور نہ خدمت کا احساس بس مشینیں چلتی رہتی ہیں گرم ہوا آئی تو گرمی پہنچادی اور سرد ہوا آئی تو سردی پہنچادی ۔ لیکن اخلاص و محبت میں تو بڑی ٹھنڈک اور خنکی ہوتی ہے ۔ ہم اللہ تعالےٰ سے اخلاص و محبت کی خنکی طلب کرتے ہیں ۔ ہم دونو!

نئی دہلی ۔ ۲۶ اگست ۴۶ء

---

(۳۰)

کل ایک خط لکھ چکا ہوں ۔ آج پھر لکھ رہا ہوں اس لئے کہ محسوس ہوتا ہے جیسے بہت سی باتیں باقی رہ گئی ہیں ۔

تمہارے مطلوبہ پمفلٹوں کی فہرست مل گئی ۔ کچھ بھیج رہا ہوں باقی جلد بھجوادوں گا ۔

ٹھیک کہتی ہو کہ دین کی جتنی سمجھ جتنی بھی تفصیل سے ہو اتنا ہی بہتر ہے ۔ فی الحال اگر تم یکسوئی اور غور و فکر سے صرف مطالعہ ہی کرتی چلی جاؤ اور جوں جوں مطالعہ کرو اسے اپنی زندگی پر بھی وارد کرتی جاؤ ۔ تو اس مرحلے پہ اتنا ہی کافی ہے ۔ ان میں جو آسان قسم کے مضامین ہوں وہ گھر میں دوسروں کو بھی سنادیا کرو ۔ جب ایک مسلمان پر اپنے فرائض کا احساس واضح ہو جائے تو پھر اس پر یہ ڈیوٹی بھی لگ جاتی ہے کہ اس کے اپنے گھر میں، اپنے ماحول میں، ارد گرد اور اپنی رسائی کی حد تک کسی جگہ پر بھی خدا سے

غفلت کا بیج نہ رہنے دے اور جہاں تک اس کے لیے ممکن ہو اسے بلا جھجک دور کرنے کی مختلف طریقوں سے سعی کرتا رہے۔ بس اسی کا نام تبلیغ ہے اور یہی اظہارِ ایمان کا احسن طریقہ ہے۔ میری غلط رائے اور غلط بات کے مقابلے میں تمہیں اپنی نیک رائے اور صحیح بات کہتے ہوئے کبھی نہ جھجکنا چاہیے اس لیے کہ اللہ کا نام بلند کرنا سب سے بڑی عزت کا کام ہے۔

جوں جوں مطالعہ کرو جہاں جہاں شکوک پیدا ہوں مجھے ان سے ضرور باخبر رکھو میں انشاء اللہ اپنی حد تک انہیں سلجھانے کی کوشش کروں گا۔

دادا جان کے گھر میں اسلامی ماحول کا کیا حال ہے؟ کیا وہاں کی فضا تمہاری باتوں کیلئے سازگار ہو سکتی ہے اگر ہو سکے تو وہاں بھی یہ کتابیں پڑھنے کے لیے دے دیا کرو۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگ اسلام کو اس کے صحیح رنگ میں سمجھنے لگ جائیں۔ اسلام مذہب نہیں مشن ہے۔ جو لوگ اسلام کی اس حقیقت کو سمجھ جائیں گے وہ خود بخود دوسری باتوں سے ہٹ کر اللہ کے اس راستے کی طرف آ جائیں گے۔ سب سے پہلے لوگوں کے ذہن کی زمین ہموار کرنی چاہیئے۔ پھر جب زمین کاشت کے قابل ہو جائے تو وہ کمزور بیج کو بھی اگا دیتی ہے۔ اور دعوتِ دین کا بیج تو بہت مضبوط ہوتا ہے۔

آج اتوار ہے اور اجتماع پر جا رہا ہوں اس لیے جلد جلد لکھ رہا ہوں ابھی دو تین احباب آنے والے ہیں اس لیے ان کے آنے سے پہلے ہی ختم کر رہا ہوں۔ ان دنوں بہت یاد آ رہی ہو۔

ے نہیں آتی جو ان کی یاد برسوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

اگرچہ شعر بہت غلط لکھتا ہوں لیکن یہ شعر پہلے مصرعے سے اختلاف کے ساتھ مجھے بہت پسند ہے۔ شعر میں غلطی ہو تو نظر انداز کر دینا۔ غلط شعر پڑھنا اور لکھنا میری ہابی ہے۔

نئی دہلی۔ ۲۷ اگست سنہ ۴۶ء

---

(۳۱)

تمہارا خط ملا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ تم نے ناناجی کے عرس میں شرکت کے لیے مجھ سے اجازت طلب کی ہے وہیں پہنچ کر اپنے دل اور ضمیر سے پوچھ لیا ہوتا۔ مجھے تو یقین تھا کہ تم اب ایسی اجازتوں سے بلند ہو پھر بھی خدا جانے تمہیں کیا سوجھی کہ مزید تصدیق کے لیے مجھے ہی لکھ بھیجا۔ بزرگوں کے اصرار تو رہیں گے ہی۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ اسلام قبروں کے لیے فاتحہ سے زیادہ اور کسی جشن کی اجازت نہیں دیتا۔ کم از کم میں اپنی حد تک تو اسی کا قائل ہوں اور اسی لیے متعجب ہوں کہ تمہیں ایسی باتوں کیلئے ابھی میری رائے معلوم کرنے کی ضرورت باقی ہے۔ اور پھر قوّالوں اور مراثیوں پر روپوں کی بارش۔ مومن تو اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ آخر قوالوں پر خرچ کس مد میں جائے گا۔

لوگوں کے خصائل کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے کوئی ایک ہی سنی سنائی بات یا کسی ایک ہی شخص کی روایت کافی نہیں ہوتی۔ بلکہ کسی شخص کے متعلق مختلف ذرائع سے تھوڑی تھوڑی معلومات مل جل کر ہی اس شخص کا صحیح نقشہ بناتی ہیں۔ مثلاً اگر ایک ہی

شخص تمہارے سامنے میری بہت سی تعریف کرے یا سخت برائی کرے تو ہو سکتا ہے کہ یا تو وہ میرا گہرا دوست ہو اور میری کمزوریوں کو بھی چھپا رہا ہو یا وہ میرا دشمن ہو اور میری خوبیوں کو بھی عیب بنا کر پیش کر رہا ہو۔ اس قسم کی یکطرفہ معلومات سے میرا صحیح کردار تمہیں معلوم نہ ہو سکے گا ممکن ہے کہ میرا کردار اس نے خاص طور پر اپنے ہی نیکی یا برائی کے زاویہ نظر سے دیکھا ہو۔ اس لیے جب مختلف لوگوں کی زبانی ہم کسی شخص کے بارے میں کچھ باتیں سنتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان باتوں میں برائی کتنی ہے اور اچھائی کتنی ہے۔ پھر دیکھتے ہیں کہ ان میں ایک ہی قسم کی برائی کتنی ہے اور ایک ہی قسم کی اچھائی کتنی ہے۔ پھر ہم ان روایت کرنے والوں کے حالات ان کا اعتبار اور ان کے اس شخص کے ساتھ تعلقات پر غور کرتے ہیں اور جب ہم سب اندازے لگا لیتے ہیں تب ہم اس کے متعلق برا یا بھلا فیصلہ ذہن میں کر سکتے ہیں۔ ہمیں کسی کے متعلق ایک شخص کی زبانی سن کر فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے یہ تو زیادتی کی بات ہے۔ انسان کو جب خدا نے عقل دی ہے اور ضمیر بھی دیا ہے تو ان چیزوں کو بھی اس معاملے میں استعمال کرنا چاہیئے۔

میں نے کتابوں کا پارسل بھجوا دیا تھا۔ مل گیا ہوگا۔ دوست آ رہے ہیں اس لیے رخصت چاہتا ہوں۔ "خدا حافظ"۔

نئی دہلی۔ ۶ ستمبر ۱۹۴۶ء

۴۲

——تمہارے خطوط میں پریشانی کا اظہار بڑھ گیا ہے، مطمئن رہو میرا تو ذاتِ واحد پر بھروسہ ہے وہی سب قفلوں کا کھولنے والا ہے اس لیے دل کی یہ متاعِ بیقرار اسی کے حضور میں فریاد کناں ہے۔ اس آوازِ خاموش سے کسی کے کان آشنا نہیں ہو سکتے۔ اپنی پریشانیاں اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے ہی رکھنا بندے کے شایانِ شان ہے۔ اپنے جیسے بندوں کے سامنے رکھنا عزتِ نفس کے خلاف ہے۔ میں شاید عید پر آؤں یقین سے کہہ نہیں سکتا۔ اب میری سب سے بڑی خاموش جدوجہد یہ ہے کہ انگریز کی ملازمت ترک کر دوں۔ اس لیے کہ میرا ایمان مجھے طاغوت کی چاکری پر ملامت کرتے کرتے مجھے بار بار بے بس کر دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ حلال کو اس حرام پر ترجیح دینے کے لیے مجھے اپنے موجودہ معیارِ زندگی سے نیچے بھی اترنا پڑے۔ لیکن مسلمان تو کسی معیارِ زندگی کا قائل ہی نہیں ہے اس کا معیارِ زندگی تو خدا کی راہ میں حق کا ساتھ دینا ہے چاہے اس راستے میں اس کا سب کچھ لٹ جائے مجھے اگر کوئی شخص کہے کہ معیارِ زندگی کا بلند ہونا ضروری ہے تو میرے پاس صرف یہی جواب ہے کہ "کیا راہِ خدا کے سفر سے بھی زیادہ ضروری ہے" اگر وہ خدا کے سفر سے زیادہ ضروری نہیں ہے اور میں کہتا ہوں کہ یقیناً نہیں ہے تو پھر یہ معیارِ زندگی کیا شے ہے۔ کیا کسی خاص معیارِ زندگی کی تصدیق رسول پاکؐ کی سنت اور حیاتِ پاک سے بھی ہوتی ہے؟ کیا کسی خاص معیارِ زندگی کی تصدیق صحابہ کرامؓ کی زندگیوں سے ہوتی

ہے؟ کیا اولیائے کرام کی زندگیوں سے کوئی خاص معیار سامنے آتا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر آخر ہمارے لیے یہ کیوں ضروری ہو گیا ہے کہ اللہ کے راستے میں معیارِ زندگی گر جانے کے خوف سے کوئی دکھ نہ اٹھائیں اور عیش کا انتظار کریں۔ جس مبارک کام میں رسول پاکؐ کے دندانِ مبارک تک شہید ہو جائیں اس کام میں ہماری ایک ہڈی بھی نہ ٹوٹے؟ جس راہ میں رسول پاکؐ نے اپنے پیٹ پر پتھر باندھے ہوں ہمیں اس راہ میں ایک فاقہ بھی نصیب نہ ہو! جس راہ میں رسولؐ نے پتھر کھائے ہوں خون بہایا ہو۔ ان کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے ہوں۔ ہم اس راہ پر سے ایک پتھر کھائے بغیر ایک قطرۂ خون بہائے بغیر اور ایک کانٹا برداشت کئے بغیر گزر جائیں اور ساتھ ہی یہ دعوے بھی ہو کہ ہم انہیں کے پیرو اور انہیں کی امت میں ہیں بلکہ مزید یہ توقع کہ امتی ہونے کے فخر سے ہمیں دنیا میں کوئی دکھ بھی نہ پہنچے اور معیارِ زندگی میں بھی کوئی فرق نہ آئے۔ اور آخرت میں جنت کا ٹکٹ بھی ہمارے ہی ہاتھ میں تھما دیا جائے۔ حالانکہ واضح طور پر یہ بتایا جا چکا ہے کہ

اس راستے میں پہلے لوگوں کو مصیبتیں آئیں۔ "وہ جھنجھوڑے گئے، ہلا مارے گئے یہاں تک کہ رسول اور ان کے ساتھی پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ سنو کہ اللہ کی مدد قریب ہے"۔

کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہیں یونہی جنت مل جائے گی جنت تو دکھوں کی اوٹ میں گھری ہوئی ہے۔

کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہیں آزمایا نہ جائے گا اور یونہی چھوڑ دیا جائے گا۔ اللہ تو آزمائے بغیر نہ رہے گا۔

غرض مومن کے لئے تو سیدھی راہ وہ ہے جو اسے جنت تک پہنچائے۔ چاہے راستے میں ہزاروں مصائب کے کانٹے ہوں۔ اور ٹیڑھی راہ وہ ہے۔ جو اسے دوزخ کے دہانے پر لے جاکر کھڑا کر دے چاہے اس میں پھولوں کی کیاریاں اور آرام و راحت کی خوشبوؤں کی لپٹیں ہوں آزمائش میں کامیابی تو یہ ہے کہ انسان خدا کی راہ میں عیش کا راستہ چھوڑ کر دکھ کا راستہ محض اللہ کے لیے اختیار کرے اور جب اس سے پوچھا جائے تو وہ صاف کہہ دے کہ ہم نے تو روزِ اول سے ہی اپنی جانوں کو اللہ کے ہاتھوں بیچ دیا ہوا ہے۔

اب نماز فجر کا وقت قریب ہے اس لیے ختم کرتا ہوں۔

نئی دہلی۔ ۲۰ ستمبر ۷۶ء

۳۴

خط ملا۔ تمہارے خطوط میں ابھرتی ہوئی اسلامی اسپرٹ سے مجھے مسرت ہے تم نے لکھا ہے کہ اللہ کی ذات کے سوا میں آج تک کسی پر توکل نہیں کیا۔ بس یہی مومن کی شان ہے کہ وہ دنیا کے تمام سہاروں اور توکلوں سے بے نیاز ہو کر صرف اللہ کے سہارے اور توکل پر ہی تکیہ کرتا ہے اس کے سوا کسی دوسرے پر توکل کرنا شرک ہے۔ اور یہی وہ پختہ اور محکم ایمان ہے جس کے سہارے مومن زندگی کی کڑی دشواریاں ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے۔ زندگی کی کوئی دشواری بھی اسے پریشان نہیں کر سکتی اور

مصائب کے مقابلے میں تبسم اس کے چہرے پر موت کے وقت بھی ہوتا ہے۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم

چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

تو جب موت کے مقابلے میں بھی مومن کا یہ طرزِ عمل ہے تو اس سے کم تر مراحل میں مومن بھلا کیوں پریشان ہونے لگا۔ اس کا ایمان تو زندگی کی ہر سختی اور مصیبت کے ساتھ اور زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے دنیوی مصائب اور تکالیف کی آگ اسے یوں پکا دیتی ہے جیسے کچے برتنوں کو کمہار کا آوا پکا دیتا ہے۔ تم میں ایمان کی یہ صفات دیکھ کر میں بڑی تقویت محسوس کرتا ہوں۔ تجارت کے کام پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کی خرابیوں کے بارے میں جس خاتون کی مثال تم نے دی ہے وہ افسوسناک ہے۔ بعض لوگ ملازمت اس لئے چھوڑتے ہیں کہ انہیں ملازمت میں کم آمدنی ہوتی ہے اور تجارت میں وہ زیادہ کما کر امیر بننا چاہتے ہیں۔ وہ تو دراصل ایک حرام سے دوسرے حرام کی طرف لپکتے ہیں اور یہ کوئی قدر و قیمت کی بات نہیں ہے۔ کوئی شخص اس باطل نظام سے نفرت رکھے اور پھر اس کے اندر زیادہ سے زیادہ کمانے کا شوق بھی رکھے تو یہ الٹی بات ہے۔ میں اس نظام کی ملازمت اس لیے ناپسند کرتا ہوں کہ یہ اللہ کے باغیوں کی مشینری کا پرزہ بناتا ہے اور مسلمان ہونے کا دعوےٰ کرتے ہوئے یہ مشکل ہے کہ ہم اللہ سے ہٹے ہوئے لوگوں کے بنائے ہوئے نظام میں جیتے رہیں۔ لہٰذا اس حرام روزی سے اگر حلال کی روزی مجھے صرف زندہ رہنے کے لیے بھی ملے تو مجھے وہ منظور ہے۔ میں ملازمت چھوڑ کر تجارت کی طرف اس لیے نہیں آنا چاہتا کہ وہاں جا کر امیر بن جاؤں بلکہ اس لیے کہ تجارت

کو اپنی کوشش سے حلال روزی کا ذریعہ بناؤں۔ ایک شخص جو ملازمت اس لیے چھوڑ رہا ہو کہ اسے مسلمان رہنا ہے اور حلال روزی کی طرف جانا ہے وہ اگر تجارت میں آکر حرام چیزوں میں پڑ جائے تو پھر تجارت کے حرام اور ملازمت کے حرام میں فرق ہی کیا رہ گیا۔

تم اس وقت کچھ اس موڈ میں نظر آتی ہو جیسے دو شخص جھگڑنے کے لیے پُر تولا کرتے ہیں اور ایسی حالت میں نقصِ امن کا خطرہ پیدا ہو جایا کرتا ہے اس سے بچاؤ کی ایک ہی صورت ہو سکتی ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک کا دل زیادہ بڑا ہو اور اس کا دماغ زیادہ سنجیدگی سے معاملات پر غور کر سکتا ہو۔ دماغ میں گرمی کم ہو اور دل میں زیادہ ہو ایسی حالت ہو نقصِ امن کا خطرہ ٹل جایا کرتا ہے اب موجودہ صورت میں یہ پارٹ میں ہی ادا کرتا ہوں اور تمہارے حصّے میں غصہ اور ناراضگی چھوڑ کر میں صلح مندی کا راستہ اختیار کرتا ہوں۔ بڑا دل اس شخص کا ہوتا ہے جسے ناراض کرنا بھی مشکل ہو اور خوش کرنا بھی مشکل ہو۔ اور چھوٹا دل اس کا ہوتا ہے جسے ناراض کرنا بھی آسان ہو اور خوش کرنا بھی آسان۔ اب تم اندازہ لگا لو کہ تمہیں کون سا دل پسند ہے۔

تمہارے سارے غصّے والے الزامات مجھے اپنے ذمے منظور ہیں۔ خط نہ لکھنے کا، یہاں مکان کے لیے کوشش نہ کرنے کا، اور بہت سے دوسرے بھی جو تمہیں بعد میں سوجھیں۔ کہو اب تو خوش ہو؟ تم الزام دیتی جاؤ میں اقرار کرتا جاؤں گا۔ لیکن ایسے الزامات خطوط سے زیادہ زبانی لطف دیا کرتے ہیں۔ امید ہے کہ تم غصّہ تھوک کر مجھ سے جلد

ہی راضی ہو جاؤ گی۔ خط تو میں لکھتا ہی رہوں گا

نئی دہلی - ۲۶ ستمبر ۱۹۴۶ء

---

(۳۴)

بڑے انتظار کے بعد تمہارا عزیز خط ملا۔ آخر تم اتنی پریشان کیوں ہو جاتی ہو، اور اپنے دل و دماغ کو افسردہ کرتی ہو۔ خدا کے دیئے ہوئے دل و دماغ کو یوں افسردہ کر کے مضمحل کرنے کا تمہیں کیا حق پہنچتا ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ اگر غم و الم اٹھایا جائے تو وہ صرف اللہ کی راہ میں ہو ورنہ دنیا کے ان ادنیٰ اور گھٹیا معاملات کو کیوں جرأت ہو کہ وہ ایک مسلمان کو لمحے بھر کیلئے بھی افسردہ کر سکیں۔ ہاں غم ہو تو دین کا غم ہو۔ باقی سارے غم خدا کے حوالے کر دیئے جائیں۔ ایک مسلمان جس نے سوچ لیا ہو کہ صرف ایک اللہ کی راہ ہی ایسی ہے جس کے لیے اس کی ساری کوششیں تکلیفیں غم و آلام قوت برداشت ثابت قدمی اور استقلال محفوظ ہیں وہ بھلا دوسری راہوں کی ٹھوکروں رکاوٹوں اور اندیشوں سے کیوں ڈرنے لگا۔ کبھی مجھے بھی یہ عادت تھی کہ خواہ مخواہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر گھبرایا کرتا تھا یوں نہ ہوا تو کیا ہوگا اور یوں نہ ہوا تو کیا ہوگا۔ اب ان سارے اندیشوں کا واحد جواب میرے پاس تو یہی ہوتا ہے کہ ہوگا وہی جو اللہ کو منظور ہوگا۔ پھر پریشانی غم اور افسوس کس بات کا۔ کسی کے لیے روپے کی افراط

کامیابی ہے کسی کے لیے بلند مناصب کا حصول کامیابی ہے۔ کسی کے لیے مکان وجائیداد میں اضافہ کامیابی ہے۔ لیکن ایک باشعور مسلمان کی کامیابی یہ ہے کہ اس نے اللہ کی راہ میں کتنے قدم اٹھائے اور اس کی راہ میں کیا تکلیف سہی اس کے لیے اپنے مال، وقت، دولت اور خواہشات نفس کی کیا قربانی دی اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے کتنی جدوجہد کی۔ اگر اس معاملے میں وہ کامیاب ہے تو اس کی تکلیف عین راحت ہے۔ اس کی غربت عین امارت ہے اس کا دکھ عین سکھ ہے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اس بات کا احساس اس کے دل و دماغ میں جم کر روح میں اتر گیا ہو کہ ہمیں ایک دن اس خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے جو اس ساری زمین اور آسمان دنیا کے ان سارے کاروبار مال و دولت سونا چاندی اور جائیدادوں کا واحد مالک ہے۔ میں اس راہ میں بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا ہوں تاکہ جو قدم آگے جائے وہ پیچھے نہ آئے اس لیے کہ یہ راہ سب سے زیادہ کٹھن اور قربانی کی راہ ہے۔ مجھے احساس ہے کہ جب کسی شخص نے دل کی آنکھوں سے اس راہ کو دیکھ لیا ہو جو ہدایت کی راہ ہے پھر اگر وہ اس سے پیچھے ہٹے تو وہ بہت پستی میں جا گرتا ہے۔ اس لیے اس بات کو خوب اچھی طرح سوچ لو کہ زندگی اگر شیطان کی راہ سے ہٹا کر اللہ کی راہ میں لگانی ہو تو یہ راہ بڑی کٹھن ہے۔ آج کل اللہ کی اس راہ پر چلنے والے خال خال ہی مسافر ہیں۔ اللہ کا دین غالب نہیں ہے اللہ کی بندگی کی یہ راہ کانٹوں اور مزاحمتوں سے بھر گئی ہے اگر ہر مسلمان اس راہ پر چل رہا ہوتا اور یہ آباد راستہ ہوتا تو پھر یہ تکالیف نہ ہوتیں۔ لیکن جس نے تہ دل سے اللہ کی بندگی اختیار کر لی اسے تو ہنسی خوشی اس راہ پر چلنا ہی ہے۔ اس لیے

جانِ من - اللہ کے راستے پر چلنے کی مسرت کو ہاتھ سے نہ دو - خوش رہو اور خوش رہنے کی کوشش کرو آخر ہمیں کون سا غم ہے جس میں ہم خواہ مخواہ گھلتے رہیں - کیا فرعون کی طرح تخت حاصل کرنے کی فکر ہے؟ کیا نمرود کی طرح خدائی کرنے کی آرزو ہے؟ کیا شداد کی طرح محلات کی بہشت بنانے کی تمنا ہے؟ کیا قارون کی طرح دولت جمع کرنے کی خواہش ہے؟ مجھے یقین ہے کہ خدا کے فضل سے ہم دونوں کو ان میں سے کوئی فکر بھی نہیں ہے۔ مومن کی حیثیت سے اگر ہم تخت بھی حاصل کرلیں تو بھی بوریا پر ہی سونا ہے اگر خزانے بھی جمع ہو جائیں تو ان میں سے حق سے زائد کوڑی بھی اپنی نہیں - پھر فکر کیسی؟ پریشانی کیوں، غم کس بات کا؟ میں یہ ہرگز پسند نہیں کرتا کہ تم پریشانی کا شکار رہو ابھی ہمیں دنیا میں بہت سے کام کرنے ہیں ایک مثالی اسلامی زندگی شروع کرنی ہے جس کے لیے ہمیں اپنے اخلاق کو بہت بلند کرنا ہوگا۔ دولتمند تو ہزاروں نظر آتے ہیں - پختہ کوٹھیوں والے بھی بہت ہیں - کاروں میں بے شمار لوگ گھومتے ہیں لیکن اخلاقی لحاظ سے ان میں سے بیشتر انسانی برادری پر بوجھ اور دیوالیے ہیں۔ ان سے کسی کام کے آدمی کو کیا غرض ہو سکتی ہے - وہ اپنے پیٹ کے بندے ہیں۔ اور ہمیں خدا کی بندگی کرنی ہے - مثالی زندگی یہ ہے کہ انسان خدا کی سچی بندگی کرے - اپنے اصول کا پختہ ہو - مفلسی میں بھی اس راہ پر گامزن رہے جو اس نے سوچ سمجھ کر اختیار کرلی ہے۔ اخلاقی لحاظ سے بلند ہو - دکھ برداشت کرلے لیکن کسی کو دکھ نہ دے - دوسروں کے گرے ہوئے اخلاق دیکھ کر اپنا اخلاق نہ گرائے۔ میرے نزدیک یہی چیز اصل انسانیت ہے ورنہ بڑے بڑے ریشمی سوٹوں اور پوشاکوں میں درندوں کے سے ایسے ایسے بھیانک چہرے نظر آتے ہیں جو

انسانیت پر داغ ہیں۔
بعض لوگوں کی ناگوار باتوں پر تم پریشان رہتی ہو۔ وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسول ؐ کی راہ چھوڑ کر غیبت، چغلی، جھوٹ، فریب، مکر، دل کی سیاہی اور عمل کی نامسلمانی کی حد تک پہنچے ہوئے ہوں تم ان سے اعلےٰ اخلاق کی توقع نہ رکھو البتہ انہیں تمہاری طرف سے اعلیٰ اخلاق کی توقع ضرور ہونی چاہیئے۔

نئی دہلی۔ ۲۹ ستمبر ۴۶ء

---

(۳۵)

کافی انتظار کے بعد تمہارا خط ملا۔ کچھ دنوں کے خلاء نے تشنگی سی پیدا کر دی تھی۔ میری باتوں میں تمہیں مذہبی رنگ نظر آیا ہے۔ میرے نزدیک مذہب خدا کے قانون کا دوسرا نام ہے اور زندگی اسی کے مطابق گزارنا حقیقی ایمان ہے۔ اب جو خدا ہمیں نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ کے احکام دیتا ہے اگر وہی ہماری زندگی کا مالک ہے تو پھر ہماری ساری زندگی کے ہر شعبے کو اسی کے احکام کے ماتحت ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ نماز کا اور دوسری ظاہری عبادات کا طریقہ بتا سکتا ہے اور اس کا حکم دے سکتا ہے تو وہ یقیناً ہماری زندگی کے دوسرے معاملات میں بھی ہماری رہنمائی کر سکتا ہے اور جو نہ کرے تو پھر ہمارا دین مکمل نہیں ہے۔ اگر ہمیں نماز کا حکم دیا گیا ہے تو دنیا کے کاروبار میں حصہ

لینے کا طریقہ بھی بتلا دیا گیا ہے۔ ہمسایوں سے یوں ملو۔ کاروبار میں یوں اخلاق برتو۔ دیانت، امانت وعدہ وفائی اور اخلاق کی بلندی یوں قائم رکھو۔ کمزوروں کو یوں مدد دو۔ بیوی بچوں بوڑھوں اور بزرگوں سے یوں سلوک کرو۔ غرض زندگی کے ہر دائرے میں مذہب ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اس لیے ہماری ساری زندگی ہی مذہبی زندگی ہے۔ اگر ایک شخص عبادت کو اچھے طریقے پر ادا کرتا ہے لیکن زندگی کے دوسرے کاموں میں امانت دار نہیں ایمان دار نہیں بلکہ خیانت کرتا ہے۔ رحم نہیں کھاتا۔ حقوق نہیں ادا کرتا کردار کا گرا ہوا ہے۔ دوسروں سے برا سلوک کرتا ہے۔ وہ شخص پورا اور خالص مومن کیسے ہو سکتا ہے۔ خالص اور پورا مومن تو وہی ہے جو زندگی کے ہر معاملے میں اللہ کی اطاعت کا راستہ اختیار کرے اور اس پر قائم رہے۔

ہندوؤں اور عیسائیوں کی طرح ہفتہ میں ایک بار عبادت خانے میں جا کر عبادت کر کے اور پھر ہفتہ بھر کے لیے آزاد ہو جانا مومن کے لیے نہیں ہے۔ وہ تو ہر کام میں چوبیس گھنٹے اللہ کا بندہ اور اس کا مطیع فرمان ہے۔ اس لیے تمہیں میری ساری گفتگو میں مذہبی رنگ نظر آتا ہے۔ دعا کرو کہ اللہ پاک ہمیں اپنی پوری زندگی اپنی راہ میں لگانے کی توفیق دے۔ اور پھر اسی راہ میں موت دے۔ اس لیے کہ اللہ کا راستہ ہی ایک سیدھی راہ ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ان دنوں پوری دنیا پر دجالی حالت طاری ہے ہر شخص دنیا کے لالچ میں مبتلا ہے۔ اس حالت میں دین کے سیدھے راستے پر قائم رہنا سب سے زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ اس دور میں شرک اور گناہ دنیا میں ہوا کی طرح پھیل گیا ہے اس حالت

میں سیدھی سمت پر رہنا اور اس پر تھوڑا تھوڑا آگے بڑھنا ہی بڑا کام بن گیا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں اللہ ہی سے دعا کرنی چاہیئے کہ وہ ہمارے قدم ڈگمگانے نہ دے۔

تم نے رسول پاک ؐ کا ارشاد نقل کیا ہے۔ مجھے مسرت ہوئی۔ واقعی اگر ہم قیامت کا خیال کریں اور اس کی حقیقت ہمارے دلوں میں اتری ہوئی ہو تو پھر ہمیں موجودہ زندگی بہت مختصر معلوم ہوگی لیکن دنیا کی اس زندگی میں مسرت اور غم کو ساتھ رکھا گیا ہے۔ صرف غم کا احساس انسان کو پژمردہ اور بے عمل کر دیتا ہے اور صرف مسرت کا احساس انسان کو غلط راستے پر ڈالنے اور عیش و عشرت میں مبتلا ہونے کا موقع دیتا ہے اس لیے دونوں جذبوں کو توازن کے ساتھ ہی زندگی میں رہنا چاہیئے۔ اور انسان جس قدر ان دونو جذبوں میں توازن پیدا کرے اسی قدر قوی اور توانا رہتا ہے اور سیدھے راستے سے نہیں بھٹکتا۔

شاید میرے خطوط کی خشکی سے تم گھرا رہی ہو۔ بس تھوڑی سی عادت بدل ڈالو تو یہ خشکی تمہیں خوشگوار محسوس ہوگی۔

نئی دہلی - ۲، اکتوبر ۴۶ء

۳۶

لو بھئی۔ الفت و محبت کا تحفہ قبول کرو۔

آج صبح دفتر کے لیے نکلا ہی تھا کہ بمبئی کے ایک پرانے دوست تشریف لائے۔

ان کی آمد کا خط پہلے مل چکا تھا۔ کسی کام کے لیے اجمیر تشریف لائے تھے وہاں سے مجھے ملنے کے لیے یہاں آ گئے۔ لہٰذا آج کا دن انکی خاطرداری میں مصروف رہا۔ رات بھر سفر کرتے رہے ہیں اور اس وقت دن کو رات میں تبدیل کرنے کی کوشش میں سو رہے ہیں۔ یہ بہت عمدہ ادیب اور شاعر ہیں لیکن مقصدِ شعر و ادب ابھی متعین نہیں ہے۔ سوائے دوستوں کی مجلسوں میں سنانے اور داد و تحسین وصول کرنے کے دوسرا کوئی مقصد نہیں۔ میں بھی ان کی تخلیقی کاوشوں کا مداح رہا ہوں۔ لیکن اب اس بے مقصد خرافاتی ادب کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں رہے ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ ان سے کس طرح نپٹوں گا۔ جب جاگنے کے بعد وہ مجلس شعر و ادب منعقد کریں گے تو انہیں ضرور بے لطفی ہو گی۔ شاید اس ملاقات کے بعد کہیں رشتۂ الفت ہی نہ توڑ جائیں بہرحال باتیں ہوں گی۔ اگر میرے خیال سے کچھ اتفاق کر گئے تو زہے نصیب۔ انشاءاللہ ان سے رات کو باتیں ہوں گی۔

لوگوں کا عجیب حال ہے اپنے حالات و کوائف کے محور پر مرکوز رہتے ہیں۔ ان میں کسی تبدیلی کے امکان پر کم ہی غور کرتے ہیں۔ جن خیالات کا لبادہ انہوں نے برسوں پہلے اپنے دل و دماغ کو پہنادیا تھا پھر اس پر نظرِ ثانی کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کرتے اور نہ کبھی ان میں ترمیم و اصلاح کے لیے غور کرتے ہیں۔ اپنے خیالات کو خدا کی بنائی ہوئی کائنات کے واضح اصولوں پر بھی نہیں پرکھتے۔ بعض لوگ تو ساری عمر دل و دماغ پر تالے لگا کر ان کی کنجی روزمرہ کی زندگی کے ویرانے میں کھو دیتے ہیں اور ساری عمر ایک کولہو کے بیل کی طرح گزارہ جاتے ہیں۔ تمہارے لیے یہ گفتگو مہمل ہو گی۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ چند سال تک مروجہ

خرافاتی ادب نگاری اور افسانہ نویسی کرتا رہا ہوں۔ اب شعورِ ذات کی آنکھ کھلی ہے تو حیران ہوا ہوں کہ میں یہ کیا کرتا رہا ہوں۔ اب اس حرکت سے تائب ہوا ہوں لیکن بے ادبی کے اس دور کے بہت سے لوگ جو اپنے آپ کو میرے حلقۂ احباب میں محسوس کرتے ہیں اسی دَور کی یادگاریں ہیں۔ اب میں اس بے ہودہ ترقی پسندانہ افسانہ نگاری کو ترک کر چکا ہوں اور اب میرے لیے زندگی کا افق ایک نیا زاویہ رکھتا ہے اس کے لیے ایک نئے اندازِ بیان اور نئے اندازِ خیال کی ضرورت ہے جو مجھے ابھی میسر نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دورِ جاہلیت کے تعلقات کب تک نبھیں گے۔ میں تو یہی کر سکتا ہوں کہ ان حضرات کو بھی اپنے اس نئے مسلک کی دعوت دوں اور جسے اس سے گریز ہو وہ اپنا پاندان اٹھا کر الگ ہو جائے۔ الگ الگ راہوں کے مسافر آخر کب تک ایک ساتھ سفر کر سکتے ہیں۔ بہرحال میں ان سے نیک ہی توقع رکھتا ہوں۔

نئی دہلی۔ ۵ اکتوبر ۱۹۷۶ء

۳۷

تمہارے الفاظ بہت شوخ ہیں اور میں خاموش طبع انسان ہوں۔ تمہاری شوخئ تحریر سے بس اسی قدر سمجھ سکا ہوں کہ بڑے انتظار کے بعد ۱۲ اکتوبر کی تاریخ آگئی ہے اور اس تاریخ کے آنے میں صرف گیارہ دن باقی رہ گئے ہیں۔ جب ہم

رُو در رُو ایک دوسرے سے باتیں کر سکیں گے۔

انتظار واقعی ایک پُر لطف کام ہے بس ایک حد تک۔ بعض اوقات آدمی سمندر پھاند جاتا ہے اور بعض اوقات ایک نالی کے کنارے کھڑا اس کی وسعتوں کے بارے میں غور کرتا رہتا ہے۔

پہیلیاں بجھاتی ہو اور میں بھول بھول جاتا ہوں ان دنوں ذہن بہت ڈل ہو رہا ہے۔ ان دنوں تو میں یہ بھی نہیں سوچ سکتا کہ میں تمہیں کیا لکھوں اور کیا کیا باقی رکھ لوں کہ پھر زبانی کہوں گا۔ باتوں کا ایک انبار ہے اور گفتگوؤں کا ایک ڈھیر ہے جس میں جو بات بھی کہنے کے لیے چنتا ہوں دل کہتا ہے ابھی رہنے دو۔ زبانی ہی سہی اور یوں اس تذبذب اور انتخاب کلام نے میرے قلم کو روک رکھا ہے۔

ان دنوں وقت بہت سست گزر رہا ہے۔ یوں کہیئے کہ گھسٹ گھسٹ کر گزرتا ہے۔ جیسے میدان جنگ میں کوئی زخمی سپاہی۔

ایک خدشہ اور سن لو اگر مجھے رخصت نہ ملی تو!! ان دنوں ہمارے دفتر میں سے کئی ایک رخصت اور بیماری پر ہیں۔ فرض کرو کہ رخصت ملنا ممکن نہ رہے۔ پھر کیا ہو گا۔ ہاں بتاؤ۔ تب کیا ہو گا پھر کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ اس صورت میں ملازمت چھوڑ کر آ جاؤں اور بقول تمہارے "نہ رہے بانس نہ بجے بانسری" لیکن مصیبت یہ ہے کہ بانس اُگتے رہیں گے اور بانسری بجتی رہے گی۔ آؤ ہم دونوں مل کر دعوتِ حق کی بانسری بجائیں۔ زندگی کو ایک منزل کی طرف لے جانے کی بانسری۔ راہِ حق پر آگے ہی آگے بڑھتے چلے جانے کی بانسری۔ اب دو بانسریوں میں سے ایک سُر نکلے گا یا ایک بانسری میں سے دو سُر نکلیں گے اور ہم بہت جلد

ملیں گے۔ بہت جلد درمیان کا وقفۂ انتظار معدوم ہوگا۔

نئی دہلی۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۶ء

---

(۳۸)

لو سنو۔ چھٹی مل گئی۔ پورے ایک مہینے کی۔ میں چلا آ رہا ہوں۔ اور جلد پہنچ رہا ہوں۔ پرسوں صبح فرنٹیر میل پر۔ اب سنبھلو بہت باتیں ہو چکیں اور ایران طوران کے قلابے ملا دیئے۔ زندگی اور مقصدِ زندگی کے فلسفے بہت بیان ہو چکے۔ قلم سے جو باتیں ہو سکتی تھیں کر لیں۔ اب تابِ تحریر اور تابِ جدائی دونو غائب ہیں۔ اب ملاقات پر ہی باتیں ہوں گی۔ زبانی باتیں۔ بہت بہت سی باتیں۔ اور کبھی نہ ختم ہونے والی باتیں۔ پھر ان باتوں کے جنگل میں سے شاہراہِ زندگی کے لیے ضرور کوئی راستہ نکلے گا۔ سیدھا اور مستقیم جس پر ہم دونوں مل کر چلیں گے۔

دوش بدوش۔ قدم بہ قدم۔ پہلو بہ پہلو۔

اب جدائی کا تلخ خشک اور طویل جنگل ختم ہوتا ہے اور ملاقات کا پُربہار شیریں چشمۂ حیات سامنے ہے۔ بالکل سامنے۔ وہ نظر آ رہا ہے۔ ۲۱ اکتوبر! اب تارے گننے کی بجائے گھڑیاں گننے کا مرحلہ ہے۔ اچھا خدا حافظ کہتا ہوں اور تمہارے درِ دل پہ دستک دیتا ہوں۔ دروازہ کھولو مسافر بہت دور سے چل کر آیا ہے۔

نئی دہلی۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۴۶ء

رخصتی کے بعد

۲۹

مہینے بھر تک کوہ طور کی سیر کر کے پھر واپس یہاں پہنچ گیا ہوں۔

آج صبح دفتر گیا تھا۔ وہ لوگ جس بے چینی سے میرے منتظر تھے بس خدا کی پناہ۔ کام ہیں بیل کی طرح جُت گیا۔ میری غیر حاضری کے سارے عرصے کا کام ان خدا کے بندوں نے میرے لیے ہی جمع کر رکھا تھا۔ چھٹیوں کے دن جو تمہاری رفاقت میں گزرے یوں اڑ گئے جیسے ساون بھادوں کے بادل یا اُڑتے ہوئے پرندوں کے سائے۔

آج شہر میں پھر فساد ہو گیا ہے۔ سارے شہر میں آٹھ بجے سے کرفیو لگ گیا ہے۔ دفتروں میں بھی چار بجے ہی چھٹی ہو گئی۔ اور غریب کلرکوں کو تو ایک گھنٹہ پہلے ہی رخصت مل گئی۔ ہر شخص بھاگم بھاگ گھر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ بچارہ کلرک بھی کتنا مظلوم ہے کہ اپنی ننھی سی جان بچانے کے لیے کتنی بھاگ دوڑ کرتا ہے۔ یہ مدقوق صورتیں اور پژمردہ چہرے۔ یہ بے چارہ کلرک تو بس جیئے جانے کی تہمت لیے ہوئے ہے ورنہ زندگی اس سے کوسوں دور رہتی ہے۔

فساد بہار میں ہے۔ فساد بنگال میں ہے۔ فساد بمبئی میں ہے۔ فساد دہلی میں ہے۔ میرٹھ الہ آباد کانپور پٹنہ ناگپور۔ فساد قیامت کی آگ کی طرح لوگوں کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ اور بے چارے مظلوم انسان جو فساد کی نوعیت سے بھی ناواقف ہیں۔ فساد کی اس چتا میں پروانوں کی طرح گر گر کر جل رہے ہیں۔ کون پوچھے ان رہنمایان کرام سے کہ ان فسادوں کا ذمہ دار کون ہے؟۔ اُس بیچارے رام لال نے کیا بگاڑا تھا جو چھاتی

لگائے ہوئے اپنے بچوں کا پیٹ پالتا ہوا مارا گیا اور اس غریب "محمد دین" نے کیا گناہ کیا تھا جو دو وقت کی سوکھی روٹی ٹوکری اٹھا کر حاصل کرتا تھا۔ ان کے تو پیٹ خالی تھے تو پھر انہیں کے پیٹ میں سب سے پہلے کیوں چھرا مارا گیا؟ ان فسادات کے ذمہ دار لوگ تو محفوظ بنگلوں میں بیٹھ کر اسکیمیں بناتے ہیں۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے تو اصولاً ان سارے فسادات کا خون مسلمانوں کی گردن پر ہے جو اپنے آپ کو مسلمان بھی کہلواتے ہیں اور زندگی میں ہر کام غیر مسلمانہ انداز میں کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو امتِ وسط بنا کر دنیا میں امن و توازن اور عدل و انصاف قائم کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ اور انہوں نے ہی دنیا میں سے ظلم و فساد، بے انصافی اور جبر و تشدد کو مٹانا تھا لیکن مسلمانوں نے خود ہی دنیا کی امامت سے ہاتھ کھینچ لیے اور قوموں کے چرواہے بننے کی بجائے خود بھیڑ بکریاں بن کر بھیڑ بکریوں میں مل گئے یہاں تک کہ بھیڑیئے ان کو پھاڑنے کے لیے آ گئے۔ ہر بیچارے غریب اور بے خبر مسلمان کا خون جو ان فسادوں میں بہتا ہے ان کے لیڈروں اور ان کے علماء و مشائخ کے نامۂ اعمال کو سیاہ کرتا ہے۔ اللہ کی پناہ۔ درندگی پناہ مانگنے لگی ہے۔ بچوں کو چیر کر ماؤں کی گود میں ڈالا گیا ہے۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر دیئے گئے ہیں۔ جلتی ہوئی آگ میں بچوں عورتوں اور بوڑھوں کو اٹھا کر ڈالا گیا ہے۔ یہ کام ان لوگوں نے کیے ہیں جو اپنے خیال میں ہندو مذہب اور اسلام کا نام بلند کرنے کے لیے اٹھے ہیں۔ کوئی اب ان سے پوچھے کہ جنگل کے جانوروں کو ان کے مقابلے میں درندے کیوں کہا جاتا ہے۔

تم یہ دو پڑھ رہی ہو گی اسے خوب غور سے پڑھ لو۔ مجھے ہر بات مفصل اور

صاف صاف لکھ دیا کرو۔ ہر وہ بات جو تمہارے دل میں آئے بھلی ہو یا بری۔ مجھے ضرور تحریر کرتی رہو۔

میں نے ابھی ابھی شام کو دفتر سے واپس آکر اپنی رہائش کے لیے ایک جگہ بندوبست کر لیا ہے۔ پہلے مکان کے قریب ہی یہ جگہ مل گئی ہے میں اس کوشش میں ہوں کہ مجھے کوئی مناسب جگہ مل جائے تو تم بھی یہاں آسکو۔ فیملی مکان جسے باپردہ بھی کہا جا سکے یہاں ملنا سخت دشوار ہے۔ بہرحال جو مل گیا ہے تو ٹھیک ٹھاک کر کے دو دیوانے اسی میں مل بیٹھیں گے۔

نئی دہلی۔ ۱۷ر نومبر ۴۶ء

---

(۴۰)

کل شہر میں جماعت کے اجتماع میں شامل ہونے کے لیے چلا گیا تھا۔ جماعت کے لوگوں سے بھی اتنے دنوں بعد ملا ہوں۔ خدا جانے ان لوگوں کو کس مسخرے نے خبر کر دی کہ میں تم سے ملنے گیا تھا۔ شادی کی مبارکباد دیتے دیتے انہوں نے مجھے تھکا دیا۔ اگرچہ یہ مبارکبادیں میرے لیے خوشگوار ہیں۔ لیکن بھئی حجاب کے مارے مجھ سے تو کوئی بات نہ ہو سکی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ بار بار کی مبارک باد کے پیچھے مٹھائی کے تقاضے چھپے ہوئے ہیں۔ آخر ایک خاموش سا وعدہ ہی مجھے اس طوفان مبارکباد سے بچا سکا۔ جو بہرحال آئندہ اجتماع میں وفا کرنا ہوگا۔

معلوم ہوا ہے کہ گزشتہ اتوار دہلی کی بجائے ضلع گڑگاؤں کے ایک چھوٹے سے قصبے نوح میں اجتماع ہوا تھا۔ یہ لوگ اپنی اپنی جگہوں پر مختلف حلقوں میں باری باری سے گردش کے ساتھ اجتماع کرواتے ہیں تاکہ ہر جگہ کے متاثرین بھی مستفید ہو سکیں۔ نوح کا قصبہ یہاں سے صرف ۵۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے سب لوگ وہاں کی روداد سنا رہے تھے۔ جن کی دعوت پر یہ حضرات گئے تھے۔ وہ صرف چند ماہ سے جماعت کے لٹریچر سے متاثر ہوئے ہیں۔ کوئی خان بہادر صاحب ہیں۔ بلدیہ کے چیئرمین ہیں۔ اسمبلی کے ممبر رہے ہیں۔ اب اللہ نے توفیق دی ہے تو دینی مطالعے کے بعد ان پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ نظام باطل کے دیئے ہوئے یہ اعزازات اللہ پاک کے ہاں مقبول نہیں ہیں۔ اب انہوں نے "خان بہادری" واپس کر دی ہے اور اسمبلی کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ اپنے دو لڑکوں کو جو فوج میں لیفٹیننٹ تھے کوشش کر کے ڈسچارج کرا لیا ہے اور مکمل طور پر اسلامی زندگی بسر کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ یہ ہے وہ سپرٹ جو دین حق کا شعور حاصل ہونے کے بعد انسان میں پیدا ہوتی ہے۔ کہاں وہ لوگ جو معمولی معمولی نوکریوں اور گھٹیا اعزازت کے حصول کے لیے اپنے فرار کی راہیں تلاش کرتے ہیں اور کوئی نہ کوئی کج بحثی یا اعتراض یا تاویل صرف اس لیے نکالے رکھتے ہیں کہ ان سے کہیں کسی قربانی کا مطالبہ نہ کر دیا جائے اور کہاں یہ جذبۂ حق پرستی کہ "بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق"۔ عزیز جانی! میں ان دنوں ڈاڑھی رکھ لینے کے مسئلے پر غور کر رہا ہوں۔ بلکہ شاید غور سے آگے بڑھ کر عمل کا میدان بھی شروع ہو گیا ہے۔ چند دنوں سے شیو نہیں بنوائی ہے۔ مزید آگے قدم بڑھانے کا ارادہ ہے۔ تمہاری کیا رائے ہے۔ ظاہر ہے

کہ خدا اور رسولؐ کی رائے سے مختلف کیوں ہو گی۔

نئی دہلی ۱۸، نومبر ۴۶ء

(۱۴)

ملازمت کے بارے میں تم نے دلچسپ باتیں لکھی ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ پختہ ملازمت کو لوگ محفوظ ذریعۂ معاش تصور کرتے ہیں اور اسے چھوڑنا کم عقلی سمجھتے ہیں لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ انسان کا ذریعۂ معاش عمر بھر کے لیے بس ایک ہی رہے۔ اللہ نے انسان کا رزق بے حساب زمین میں رکھا ہے جو اسے جس طرح چاہے حاصل کر سکتا ہے۔ یہ تو ہمارے ملک میں ایک بزدلانہ سا رواج ہے کہ لوگ جس کرسی سے چمٹ گئے بس اسی پر چمٹ کر رہ گئے اور چاہتے ہیں کہ بیس سال بعد بھی اسی کرسی سے اٹھیں۔ گویا ایک مستقل کرسی کے ذریعے اپنی زندگی کے مستقبل کو کرسی میں سمیٹ کر ہر خطرے سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ جیسے کوئی چوہیا ایک بل میں دبک کر بیٹھ جائے اور پھر وہیں ساری عمر گزار دے۔ ایسی محدود ذہنیت بڑی خطرناک بزدلی پیدا کر دیتی ہے اور توکل خدا میں کمی کر دیتی ہے۔ انسان کی کسی خاص ذریعۂ معاش سے اتنی گہری وابستگی جیسی خدا کی رزاقی سے ہونی چاہیئے بالکل مناسب نہیں ہے۔ رزق ذریعۂ معاش نہیں دیتا بلکہ خود خدا دیتا ہے چونکہ رزق کو تقسیم کرنے والا قادرِ مطلق ہے اور وہ اس کا پابند نہیں ہے کہ اپنے بندے کو صرف غیر کی ملازمت کے ذریعے ہی رزق دیا کرے۔ بہرحال مستقل

طور پر اپنی زندگی کو کسی خاص ذریعۂ معاش سے وابستہ کر لینا اور پھر اسی کی پناہ اور امان میں اپنی زندگی کا سارا پروگرام بنا لینا ہمارے ملک اور معاشرے میں بہت عام ہے۔ میرے خیال میں ہمارے معاشرے کی ذہنی پستی اور غلامی کی یہ بہت بڑی وجہ ہے۔

وہ لوگ جنہیں ہم مسلمان "زندگی کا نمونہ" سمجھتے ہیں۔ انہوں نے تو اپنے آپ کو یوں بالکلیہ فروخت کبھی نہیں کیا تھا۔ آج کوئی لکڑیاں کاٹ کر بیچتا ہے اور گزارہ کرتا ہے تو کل فوج کا سپاہی ہے اور پرسوں تبلیغ دین کے لئے چلا جا رہا ہے۔ کہیں وہ بہترین معلم ہے اور کہیں وہ فوجیوں کی کمان کر رہا ہے میں نے آج تک یہ نہیں سنا یا پڑھا کہ دنیا کی تاریخ میں کسی ایسے شخص نے بھی کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہو جس نے حشرات الارض کی طرح اپنی عمر بھر کی روزی کا حساب کر کے ایک مستقل دائرے کے اندر اپنے آپ کو محدود کر لیا ہو اور پھر ایک جھکی ہوئی کمر ایک سفید داڑھی اور ایک ٹوٹی ہوئی عینک کے ساتھ اپنی پنشن لے کر ریٹائر ہوا ہو۔ یہ انسانیت کا کوئی اعلیٰ تصور نہیں ہے۔ کیا انسان کو خلیفۃ الارض بنا کر اسی لیے بھیجا گیا ہے کہ وہ عمر بھر کے لیے کسی باطل نظام کی مشین کا پرزہ بن جائے۔ نہ سوسائٹی میں زندوں کی طرح زندہ رہے اور نہ قبر میں مردانہ وار جا سکے۔ ساری عمر ایک مشین کے پہیے کی طرح گردش کرتا رہے اور آخر ایک دن گھس گھسا کر ٹوٹ جائے اور قبرستان کے گودام میں مردوں کے ڈھیر میں پھینک دیا جائے۔ اگر یہی انسان کی زندگی کا مقصد ہے تو بخدا یہ بہت ہی گھٹیا تصورِ زندگی ہے اور انسان کو اشرف المخلوقات کہلوانے کا ایسی زندگی کے ساتھ کوئی حق نہیں ہے۔ مویشی جس طرح ساری عمر کھانے کی فکر میں رہتا ہے اسی طرح انسان بھی یہی کچھ کرتا رہا تو دونوں میں فرق کیا رہا بلکہ مویشی بہتر ہوا کہ وہ اپنے مالک سے وفاداری کرتا ہے

اور اسے کچھ نفع بھی پہنچاتا ہے۔ انسان تو اتنا کرنے سے بھی عاری ہو جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ملازمت کی پختگی پر اگر کسی شخص کی قدر و قیمت کا فیصلہ ہے تو بخدا یہ معیار انسانیت کے لیے بہت پست ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ آج کل دنیا میں انسان کم ہیں اور دوپائے بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔

آخر تم کس بات پر گھبرائے جا رہی ہو۔ پریشان نہ ہو اللہ مالک ہے۔ انسان کو دنیا میں لانا شاید اتنا مشکل نہ ہو جتنا اسے واقعی انسان بنا کر اٹھانا مشکل ہے تربیت ایک ایسا کٹھن کام ہے جو بڑے بڑے مجاہدوں کا پتہ پانی کر دیتا ہے۔ اللہ مدد فرمانے والا ہے۔ اور انسان کی قوت کے مطابق ہی اس پر بوجھ ڈالتا ہے۔ اچھا رخصت ہوتا ہوں پیار و محبت کے ساتھ مجاہدانہ زندگی کے خواب دیکھو۔ یہ بڑی بات ہے۔

نئی دہلی ۔ ۲۰ نومبر ۴۶ء

۴۲

کل کا دن بھی گزر گیا۔ لیکن تمہارے خط سے محروم ہوں۔ ذہن پریشان سا ہے۔ بتاؤ اتنے دن کی خاموشی کا کیا سبب ہے۔

گزشتہ سال آج کے دن میں تاج محل دیکھنے گیا تھا۔ بلاشبہ تاج محل تعمیر کا شاہکار ہے لیکن اسلامی نقطہ نظر سے تو ایک قبر پر اتنا خرچ کرنا دولت کا بے جا اصراف ہے۔ مسلمانوں سے اسلام کا مطالبہ تو یہ ہے کہ وہ زندگی کے سارے معاملات

ہیں اللہ کے احکام اور اس کی منشا کی اطاعت کریں۔ زندگی کا کوئی شعبہ جب تک وہ اسلام کے ماتحت چل رہا ہے اسے حق پہنچتا ہے کہ وہ خوب ترقی کرے لیکن جب وہ حدودِ الٰہی سے قدم باہر رکھے اس کا زندگی کا حق سلب ہو جاتا ہے۔ اسلام کا قانون تو ساری زندگی کا قانون ہے۔ اس کی گرفت سے زندگی کا کوئی گوشہ بھی باہر نہیں رہنا چاہیئے۔ تعمیر، مصوری۔ ادب۔ خیاطی، تقریر، خطابت، کتابت، معیشت، تمدن غرض مسلمانوں کے اندر جسے بھی زندہ رہنا ہو وہ اللہ کی حدود کے اندر زندہ رہے جو اس سے باہر نکل جائے وہ مردود و مقہور ہے اور اس کی زد خلیفۂ وقت کے بیٹے پر بھی پڑ سکتی ہے کوئی شخص کسی واسطے سے بھی اس کی حد کو توڑ کر اس کی زد سے بچ نہیں سکتا۔ اگر دنیا کے محدود وسائل اس کی بغاوت کو گرفت میں نہ لیں گے تو پھر ایک اور بہت بڑی عدالت قائم ہو گی۔ جہاں اسلام کی حدود سے باہر رہ کر گزاری ہوئی ایک ایک سانس بھی گن لی جائے گی اور ہزار پردوں میں کئے ہوئے جرائم بھی یوں سامنے آجائیں گے جیسے ان کی فلم لے لی گئی ہو۔ غرض اسلام ایک دستور العمل ہے جو ساری زندگی پر حاوی ہے اور فنِ تعمیر سے علیحدہ نہیں ہے۔ قوم عاد پر اسی لیے تو عذاب نازل ہوا تھا کہ وہ خدا کے نافرمان تھے اور بڑی بڑی عالیشان عمارتیں تعمیر کر کے نافرمانی کرتے تھے چنانچہ عمارتوں پر بیش قیمت زر و مال ضائع کر کے سینکڑوں برس کا عمارتی سامان تیار کرنا بھی ان کے لیے عذابِ الٰہی کا موجب بن گیا۔ اس سے انسان میں خدا سے غفلت اور دنیا میں ہمیشہ رہنے کا جھوٹا زعم پیدا ہوتا ہے اور انسان دنیا کو آزمائش گاہ نہیں بلکہ اپنا مستقل ٹھکانہ سمجھ لیتا ہے۔ اسی لیے تو فرمایا گیا ہے کہ چلو پھر و اور دنیا کو دیکھو۔ ان بلند و بالا دیواروں پر گری ہوئی چھتوں کو دیکھو اور ان

کے خستہ پرانے محلات کو دیکھو اور اندھے پڑے ہوئے کنوؤں کو دیکھو یہ سب گواہی دے رہے ہیں کہ ہم، ہمارے بنانے والے، اور ہمارے استعمال کرنے والے سب فانی ہیں اور فانی تھے۔

مسلم حکمرانوں کے لیے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے ذوقِ تعمیر کی تسکین کے لیے رعایا کا مال اس طرح صرف کریں جب کہ ملک میں حاجت مند معذور اور محتاج لوگ پائے جاتے ہوں۔ درس گاہیں اور اشاعتِ دین کے مراکز مطلوب ہوں۔ رعایا کے سب حقوق ابھی باقی سر پر ہوں۔ جگہ جگہ پر سرائیں کنوئیں ہسپتال اور شفاخانے تعمیر ہونے باقی ہوں۔ غریب کاشت کاروں کے لگان معاف نہ ہوئے ہوں۔ کم تنخواہ پانے والے عمال کی تنخواہیں نہ بڑھادی گئی ہوں۔ آخر اسلام اس چیز کی کیسے اجازت دے سکتا ہے کہ ایک مسلمان کی قبر پر تو مٹی کی چند ٹوکریاں پڑی ہوں اور دوسرا کروڑوں روپے کی عمارت میں مدفون ہو۔ کیا ان کا حشر خدا کے سامنے نہیں ہونا ہے جس کی نظر میں سب انسان برابر ہیں۔ کیا وہ سب ایک ہی رسولؐ کی امت نہ تھے جن کا ارشاد یہ ہے کہ امیر کو غریب پر گورے کو کالے پر عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔

جب اسلام کے ایسے کھلے کھلے احکام موجود ہوں اور خلفائے راشدین کی زندگیاں بھی ہمارے سامنے ہوں تو ایک قبر پر کروڑوں روپے کا صرف میری سمجھ سے تو بالا تر ہے۔ میں تو یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ تاج محل کسی مسلمان بادشاہ کی یادگار ہونے کی وجہ سے قابلِ فخر نہیں ہے۔

آج ۱۲ نومبر ہے اور مجھے گزشتہ سال کا ۱۲ نومبر یاد آرہا ہے جب تاج محل سے واپسی پر ہمیں رش کے سبب گاڑی میں جگہ نہ مل سکی تھی اور پائیدان پر کھڑے ہوئے

سفر کرنے کی وجہ سے ہم سب ساتھیوں کو اسٹیشن پر ریلوے پولیس نے روک لیا تھا۔ ہم نے متھرا کے اسٹیشن پر ایک آفس کی کرسی پر بیٹھ کر رات گزاری تھی اور صبح ہم ریلوے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کئے گئے تھے۔ جس نے پانچ روپے جرمانہ کر کے ہیں ٹکٹ بحال کر کے چھوڑ دیا تھا۔ اسی روز میں مارا مار دہلی پہنچا تھا اور دوسرے دن اپنی شادی کے لیے پنجاب روانہ ہو گیا تھا۔ یہ سب باتیں کل کی معلوم ہوتی ہیں لیکن اس کل اور آج میں پورا ایک سال حائل ہے۔ یوں انسان کی عمر کے سال زمانے کے پر لگا کر اڑے چلے جاتے ہیں۔

نئی دہلی - ۲۱ نومبر ۴۶ء

---

(۴۳)

آج دوپہر تک میں نے اپنے آپ کو بہلا بہلا کر تمہارے خط کا انتظار کیا ہے۔ تب جا کر تمہارا ۱۴، ذوالحج کا لکھا ہوا خط ملا ہے۔ بہر حال انتظار کے لیے صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ صبر استقلال دیتا ہے اور استقلال سے فتح ہوتی ہے۔ میں نے صبر اور استقلال سے زیادہ مضبوط اور اثر آفریں چیز کسی کو نہیں پایا ہے۔

آج کل بگاڑ تو اتنا عام ہے کہ جدھر دیکھو سارا منظر بھیانک نظر آتا ہے۔ زرق برق لباسوں میں بڑے گھناؤنے کردار چھپے ہوئے پھرتے ہیں۔ اسی لیے تو اصلاحِ احوال کی سخت ضرورت ہے۔ اصحاب سبت تو نافرمانی کے سبب اپنے چہرے بگاڑ بیٹھے تھے۔

آج ہمارے معاشرے کا یہ حال ہے کہ ہر شخص کے ظاہری چہرے سے اس کا باطنی چہرہ بھیانک ہے ۔ اصحاب سبت کے ساتھ بس یہ ہوا کہ ان کا باطنی چہرہ ہی نمایاں کر دیا گیا۔ آج اگر باطنی چہرے نمایاں ہو جائیں تو بڑے بڑے خوفناک چہرے ہر طرف دکھائی دیں گے ۔ پورا شہر درندوں سے بھر جائے گا۔ اللہ اپنا رحم فرمائے اور سب کی پردہ پوشی فرمائے ۔

آج کے معاشرے پر نگاہ ڈالو تو ہر طبقہ بگاڑ کی انتہائی پستیوں کو چھو رہا ہے ۔ پیروں نے اپنی گدیوں کو دینداری کی دکانیں بنا لیا ہے ۔ ان کے عرس اوباشوں کے اکھاڑے بن گئے ہیں ۔ حکام کو دیکھو تو ان کے دل و دماغ فرنگیوں کے دل و دماغ ہیں ۔ ان کے جسم خدا کی امانت نہیں بلکہ چور راہے کا مال ہیں ۔ ان کی روحیں کثیف اور ناپاک ہیں ۔ اسلامی روح ان کے اندر سے رخصت ہو چکی ہے ۔ عوام الناس ایک گہری تاریکی میں مویشیوں کی طرح بھٹک رہے ہیں ۔ دین کی ساری عمارت ڈھ گئی ہے لیکن علماء لوگوں کے پائنچے اونچے کرانے اور بال سیدھے کرانے میں ہی ساری توانائیاں کھپا رہے ہیں ۔

آؤ تربیت اولاد کے متعلق میں تمہیں اپنے ایک دوست کے گھر کا لطیفہ سناؤں ۔ پچھلے دنوں ان کے بچے اپنے ننھیال گئے ہوئے تھے ۔ ان کے سسرالی خاندان میں اب تک کافی مغربیت ہے ۔ ہمارے دوست کا ایک چھوٹا سا بچہ بھی اپنی نانی کے پاس چند دنوں کے لیے گیا ہوا تھا ۔ نانی نے پیار سے اسے خوشخبری سنائی کہ "ننھے تمہارے ماموں اب پہلے سے بڑے افسر ہو گئے ہیں ۔ انہیں ترقی مل گئی ہے ۔ بچے نے کچھ سوچ کر بڑی سنجیدگی سے کہا" نانی اماں ...... کیا انہیں کچھ اللہ میاں کے ہاں بھی ترقی ملی ہے ۔

"بیچاری بڑھیا کیا کہتی ۔ کہنے لگی "نہیں تو"

بچے نے ویسے ہی سنجیدگی سے سر ہلا کر کہا " نانی اماں"... پھر تو انہوں نے کوئی

ترقی نہیں کی۔ اصلی بات تو اللہ میاں کے ہاں ہے"۔ بڑھیا بیچاری چپ ہو گئی اور بچہ اپنے کھیل میں لگ گیا۔

میرے خیال میں یہ ہے وہ تربیت جس کی گہری بنیاد بچے کے ذہن میں اس وقت سے ہی ڈال دینی چاہیئے جب وہ اس دنیا میں آنکھیں ہی کھولے۔ ساری عمر لادینی کی کتابیں پڑھانے کے بعد پھر ضمیمہ کے طور پر دو چار مذہبی کتابیں پڑھا دینے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہر خیال جو بچے کے ذہن میں پیدا ہو وہ اسلامی بنیاد پر ہو اور بچہ کو اسلامی نگاہ ابتدائی تربیت میں ہی دی جائے۔ آخرت کا یقین خدا کا وجود رسول کی اطاعت دل کے اندر ایسے جما دیئے جائیں کہ ہر بات اور ہر کام کا آغاز انہیں خیالات سے ہو چونکہ ہم لوگوں کو یہ باتیں نہیں سکھائی گئیں اس لیے ہم دنیا کے فائدوں کو الگ سمجھتے ہیں اور دین کی ترقی کو الگ۔ لیکن جب ہمارے ذہن میں سے ہر بات اس کسوٹی پر سے پرکھ کر نکلے کہ فلاں کام آخرت کے لحاظ سے کتنا مفید ہے اور اللہ اور رسولؐ کی تابعداری کے لحاظ سے کتنا مفید ہے اور انسان اس کسوٹی کو یوں دل میں جمالے کہ کوئی کام بھی اس سے ہٹ کر نہ کرے۔ تو پھر مسلمان بن جانا ایسا مشکل نہیں رہ جاتا اور آہستہ آہستہ انسان کی فطرت ہی ایسی ہو جاتی ہے کہ ہر بات خود بخود اس کسوٹی پر تل کر نکلنے لگتی ہے۔ اور تربیت کا بھی یہی کمال ہوتا ہے۔ کہ بچے کے دل میں اس کسوٹی کو جما دیا جائے۔ گویا اسلامی جذبہ اور تصور اس کی فطرت کا شعوری جزو بن جائے

کل یہاں قریب کے قصبے میں میں نے ایک اور مکان دیکھا ہے۔ لیکن بھئی سچ پوچھو تو میں ان حالات کے درست ہونے تک ہرگز نہیں چاہتا کہ ایسی مخدوش فضا میں تمہیں یہاں لانے کی حماقت کروں۔ لیڈروں کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دسمبر

میں سخت فسادات ہوں گے۔ خطرہ ہر وقت سر پر ہے۔ شہر میں میں نے ایک مکان دیکھا ہے اور ملنے کی توقع بھی ہے۔ ایسی حالت میں جب کہ شجاعت کا معیار یہ ہے کہ بچوں عورتوں اور بوڑھوں کو سب سے پہلے ختم کرو یہاں تمہیں لانا خطرناک ہے۔ بہار کے مظالم تم نے سنے ہوں گے۔ درندگی کی انتہا ہو گئی ہے۔ بلکہ درندے بھی ان حرکتوں پر شرما جائیں گے۔ بہار میں ان دنوں شاید ہی کوئی مسلمان دیہات میں رہ گیا ہو بیشتر ان میں تباہ و برباد کر دیئے گئے ہیں۔ اور بقیۃ السیف بھاگ بھاگ کر شہروں میں پناہ گزیں ہو رہے ہیں۔ میرے ایک دوست عبدالغفار بھی لاپتہ ہیں میں نے ان کو دو تین خطوط لکھے ہیں انہیں کوئی جواب نہیں آیا۔ اس دورِ وحشت اور درندگی میں سب سے پہلے عورتوں اور بچوں پر ہی ہاتھ صاف کیا جاتا ہے۔ اس لیے میں تمہیں یہاں لانے میں سخت مذبذب ہوں۔ کچھ دنوں اور صبر کرو کہ یہ خونیں فضا صاف ہو جائے۔ ورنہ تم جانتی ہو کہ تم سے زیادہ مجھے فکر ہے کہ ہم جلد اکٹھے ہو جائیں۔

نئی دہلی - ۲۲ نومبر ۱۹۴۶ء

۴۴

تربیتِ اولاد کے بارے میں تم نے جو باتیں لکھی ہیں مجھے ان سے اتفاق ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ مالک نے تو کچی کلی پیدا کر دی کہ مالی جس طرح چاہے اسے گلدستے میں نصب کر لے۔ جو بچہ بھی دنیا میں وارد ہوتا ہے وہ قدرت کی طرف سے والدین کے

ہاتھوں میں مٹی کا ایک گیلا تودا ہوتا ہے وہ ڈھال کر اسے جس ڈھب چاہیں بنا لیں۔ حیوان بنا لیں، شریف بنا لیں، لچا لفنگا اور لوفر بنا لیں۔ فرشتہ بنا لیں یا شیطان بنا لیں۔ اطاعت گزار بنا لیں یا نافرمان بنا لیں، غرض جو کچھ چاہیں بنا لیں۔

لیکن کسی کو بہتر اور خوب تر بنانے کے لیے خود بہتر اور خوب تر ہونا ضروری ہے لیکن افسوس تم اس دور کی مسلمان لڑکیوں کو ہی دیکھ لو جو کل قوم کی مائیں بننے والی ہیں۔ یہ دینی تعلیم سے تو محروم ہیں۔ یورپ کی نقل نے انہیں کیا بنا دیا ہے۔ ان کے لپ اسٹک دیکھو۔ ان کے زرق برق لباسوں کی پھبن دیکھو۔ ان کے انداز دیکھو اور ان کی پست ذہنیتیں دیکھو۔ کیا یہی وہ مائیں ہو سکتی ہیں جو عمر فاروقؓ اور علی مرتضٰیؓ جیسے مسلمان پیدا کریں۔ کیا انہیں کی گودوں سے خالدؓ بن ولید جیسے مجاہد پیدا ہو سکتے ہیں۔ کیا یہی وقت پڑنے پر دشمن کو خیموں کی چوبوں سے مار کر بھگا سکتی ہیں۔ کیا یہی اسلام کی راہ میں شہید ہونے والے بیٹے کی لاش کو درخت سے لٹکا ہوا دیکھ کر یہ کہنے کی ہمت رکھ سکتی ہیں کہ "میرا بہادر شاہسوار ابھی گھوڑے کی پیٹھ سے نہیں اترا"۔ کیا یہی باپ بیٹے شوہر اور رشتہ داروں کے مارے جانے پر بھی صبر کر کے صرف امیر لشکر کی خیریت طلب کر سکتی ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے تو کیا انہیں کی تربیت سے وہ مسلمان پیدا ہوں گے جو مجاہد و غازی بنیں گے۔ جو اسلام کا نام سربلند کریں گے اور خود دنیا میں سربلند ہوں گے۔ ایسا تو کبھی نہیں ہو سکتا کہ آسمان سے فرشتے اتر کر ان ناکارہ نسلی مسلمانوں کو خاک سے اٹھا کر تخت پر بٹھا جائیں۔ اگر ایسا ممکن نہیں تو پھر آج مسلمان عورتوں کی دین سے ناواقفی اور اسلام سے ناآشنائی مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو دین سے مکمل غافل اور بے بہرہ نہ کر دے گی۔

درحقیقت بچے کی تعلیم و تربیت ہی اس کا سانچہ بناتی ہے، یہی انسان کو بناتی ہے

اور یہی بگاڑنی ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ایک عقل مند خدا ترس آدمی کو اولاد کی تمنا کرنے سے پہلے دس بار اپنے آپ کو جانچ لینا چاہیئے اگر اس میں اتنی ہمت اور استطاعت ہے کہ اپنے سے بہتر مسلمان تیار کر سکے تو اسے اس کا حق ہے کہ وہ تمنا کرے ورنہ اگر اسے موجودہ طرز کے بداخلاق لوگوں کے گروہ میں ہی چند اور کا اضافہ کرنا ہے تو پھر اپنے اس کام کو امتِ محمدی میں اضافے کی خدمت شمار کرنا مناسب نہیں ہے۔

میری زندگی میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ میں نے اپنے مالک کی ہستی کو اپنے بہت ہی قریب اور بہت ہی مہربان پایا ہے۔ وہ ہستی جو بلند ہے اعلیٰ ہے عظیم ہے غفور الرحیم اور کریم ہے۔ میں نے اپنے مالک کی ساری صفات کو ایک ایک کر کے اپنے اوپر بارش کی طرح برستے اور نوازشیں کرتے ہوئے پایا ہے۔ اور میرا دل اور سر اس کے حضور میں شکر و امتنان اور بندگی کے جذبات سے جھک گیا ہے۔ وہ دبے دبے ہونٹوں کے ساتھ ہلکی ہلکی دعائیں سنتا ہے۔ وہ ڈرے ڈرے دل کے ساتھ چھپی چھپی آرزوؤں کو پورا کرتا ہے۔ وہ سہمے سہمے ضمیر کے ساتھ سہمی سہمی تمناؤں کو پذیرائی بخشتا ہے۔ وہ چھپی چھپی گھٹی گھٹی اور دل ہی دل میں شرمسار دعاؤں کو قبول فرماتا ہے اور حالات کو ان دعاؤں کے سانچوں میں ڈھال دیتا ہے جیسے وہ سب کچھ اس کی دعاؤں کیلئے ہی مرتب کیا گیا ہو۔ مالک کی عجیب شان ہے اور اس شانِ رحیمی پر آدمی حیرانی کے ساتھ ساتھ فریفتگی محبت اور ناز بھی محسوس کرتا ہے۔ جب بندے کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کے ہونٹ کانپ رہے ہوتے ہیں اس کا دل دھڑک دھڑک کر مالک سے کچھ مانگتا ہے۔ جب اس کی آنکھیں مایوس نہیں ہوتیں اس کا ذہن نہیں تھکتا۔ اس کی زبان بے تابی سے الفاظِ دعا ادا کرتی ہے اور جب پیشانی اتنی جھک جاتی ہے کہ گویا گوہرِ مقصود لے کر ہی اٹھے گی۔ تو حکم ہو جاتا ہے کہ میرے

اس بندے کو وہ دے دو جو یہ مانگتا ہے بلکہ اس سے بھی بدرجہا بہتر جو اس کی دعاؤں سے بڑھ کر ہوتا ہے جانِ من! یہ بھی عجیب و غریب کیفیت ہوتی ہے۔

تم نے شادی کی سالگرہ کا ذکر کیا ہے۔ اس پہلی سالگرہ کے لیے میرا اتنا پیغام ہی کافی ہے کہ اپنے رب سے وعدۂ بندگی اور اطاعت یاد رکھو اور اسے کبھی نہ بھولو۔ ہمیں دنیا میں مسلمان بن کر رہنا ہے اور اس دور میں مسلمان بن کر رہنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جھوٹ کے فائدوں سے، ریاکاری کی دولت سے۔ فریب کی ترقی سے دغا و مکر کی وجاہت سے۔ حیوانیت کی عزت سے اور کمینہ پن کی حشمت سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ وہ دور ہے کہ جو شخص ان صفات کے ساتھ ایسی ناپائیدار چیزیں حاصل کرتا ہے اسے چالاک و ہنرمند کہا جاتا ہے۔ مسلمان بننے کے لیے ان سارے فائدوں سے ہاتھ کھینچ لینا پڑتا ہے جو اخلاق کی حدود سے باہر اور انسانیت کے خلاف ہوں۔ اس لیے ہمیں بہرحال اپنی انسانیت شرافت اور عزت کو قائم رکھنے کے لیے اتنا دکھ ضرور سہنا ہے کہ حضورؐ کے امتیوں میں سے کہلانے کا حق حاصل ہو سکے۔ کوئی ان نسلی مسلمانوں سے پوچھے کہ جب حضورؐ خود بھی زندگی بھر مصائب میں گھرے رہے اور بقول ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ زندگی بھر کبھی مسلسل چند دن بھی گیہوں کی روٹی نہ کھا سکے تو ہم آخر کس گنتی میں ہیں کہ سارے عیش و آرام اور فائدوں کے ساتھ جنت کی کنجیاں ہماری ہی جیب میں محفوظ رہیں۔ جو ان وہموں میں ہیں۔ اور چند وظیفے کر کے ہر طرح کی اخلاقی پستی کو گوارا کر لیتے ہیں انہیں چاہیئے کہ جان لیں کہ بہشت مصائب اور آزمائشوں میں گھری ہوئی ہے اور جس جگہ وہ مصائب ہیں جو جنت کو گھیرے ہوئے ہیں وہ یہی دنیا ہے۔ آخرت میں تو جنت و دوزخ دونوں ہی نمایاں ہو کر سامنے آ جائیں گے۔

تم نے خط میں گھبراہٹ اور بے چینی کا اظہار کیا ہے۔ تمہاری بے چینی مجھے کمزور کرتی ہے۔

گھبراؤ نہیں، ان دنوں مکان کے لیے کوشش میں نے اس لیے ترک کر رکھی ہے کہ یہاں فسادات دن رات ہوتے رہتے ہیں۔ سیاسی فضا بڑی پُرخطر ہے۔ سیاسی جماعتوں کے جھگڑوں سے غریب عوام کی جان پر بن آئی ہے۔ لیڈر لوگ الفاظ کے تیر چلاتے ہیں اور عوام چھریاں تیز کر کے گھروں سے نکل پڑتے ہیں۔ دسمبر میں اور بھی فسادات کا خطرہ نظر آ رہا ہے اس لیے کہ ان دنوں اسمبلیوں وغیرہ کے اجلاس ہوں گے۔

دہلی چونکہ مرکز ہے اس لیے یہاں ہندو مسلم کھنچاؤ کچھ بہت ہی زیادہ ہے۔ میں جس جگہ رہتا ہوں یہ سرکاری عمارات ہیں جہاں نہ ہندو رہتے ہیں نہ مسلمان رہتے ہیں بلکہ صرف بیچارے سرکاری ملازم لوگ رہتے ہیں اس لیے یہاں زیادہ خطرہ نہیں ہے۔ لیکن یہاں فیملی مکان ملنا مشکل ہے۔ بہرحال دیکھو خدا کیا راہ نکالتا ہے۔ جس نے ہمیں پیدا کیا ہے وہ ہماری ضروریات بھی خود ہی پوری کرتا رہتا ہے۔ پھر گھبراہٹ آخر کس بات کی ہے؟

بہت اشعار لکھ دیئے ہیں تم نے یہ تمہارے اضطراب کا آئینہ ہیں۔ مجھے تو بھئی اتنے اشعار یاد نہیں ہیں تم نے تو دیوانوں کے دیوان یاد کر رکھے ہیں۔

کرسمس کی چھٹیوں میں میرا ایک دوست مجھے مراد آباد کھینچ رہا ہے۔ یہ میاں خورشید علی ہیں کہتے ہیں تمہیں وہاں گاؤں کی سیر کراؤں گا اور گنے انڈے اور دودھ کھلاؤں گا۔ ابھی فیصلہ نہیں کیا۔ ابھی صرف اتنا ہی فیصلہ ہے کہ اپنی جان کو جلد اور ضرور یہاں لانا ہے۔ بس حالات کا رُخ دیکھ رہا ہوں۔

نئی دہلی۔ ۲۳، نومبر ۱۹۴۶ء

۴۵

یہ تم کیسی خبر دے رہی ہو جسے وہم کہہ کر ٹالا جا رہا تھا لیکن تم اسے حقیقت کہہ کر اپنے اوپر طاری کر رہی ہو۔ رات کے دس بجے بیٹھا یہ خط لکھ رہا ہوں۔ اس وقت جب کہ میں نے بہت ہی خشوع وخضوع سے عشاء کی نماز پڑھی ہے اور اللہ سے دعائیں کی ہیں میرا ذہن ذرا ہلکا ہو گیا ہے اور میں اس قابل ہو سکا ہوں کہ کسی معاملے کے متعلق غور وفکر کر سکوں۔ کچھ دنوں کے بعد تمہیں یقینی طور پر کچھ پتہ چل جائے گا۔ بہر حال جو تمہاری پیشین گوئی ہے۔ اگر یہی بات ہے تو سمجھ لو کہ ہم دونوں کی ذمہ داریوں میں ایک اور ذمہ داری کا اضافہ ہونے والا ہے۔ ایک ایسا اضافہ جس کے شاید ابھی ہم متحمل نہیں ہو سکتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا تو فرمان ہے کہ وہ کسی نفس کو اس کی حدِ وسعت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا اس لیے یہ ہمارا ایمان ہے کہ یہ سب کچھ ہمارے احاطۂ قدرت میں ہی ہے۔ گویا ہمیں اس فرض کو ادا کرنے کے لئے منتخب کر لیا گیا ہے کہ ہم امتِ محمدی میں ایک سچے مسلمان کا اضافہ کریں۔ اب اگر ہمیں کسی ایسے مسلمان کا اضافہ کرنا ہے جیسے کروڑوں کی تعداد میں دنیا کی گلیوں میں دھکے کھاتے پھر رہے ہیں۔ جن میں خدا کے نافرمان چور اچکے اوباش ڈاکو زانی شرابی اور لفنگے سبھی قسم کے جانور شامل ہیں تو بخدا ایسے اضافے سے بہتر ہے کہ انسان لاولد ہی اس دنیا سے گزر جائے لیکن اگر ہمیں ایک مجاہد مسلمان کا اضافہ کرنا ہے جو اپنے آپ کو اللہ کا بندہ سمجھ کر اپنی ساری زندگی اللہ کی مرضی کے مطابق گزارنے کی کوشش کرے تو یہ ایک مبارک اضافہ ہو گا۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ آنے والا اول و آخر ایک سچا مسلمان ہو تو ہمیں اس کے لیے پہلے ہی تیاری کرنی ہوگی اس کی تربیت کا اس کی آمد سے پہلے ہی انتظام کرنا ہوگا۔ ایک ماہر نفسیات کا قول ہے کہ بچہ ۱۸ ماہ کی عمر میں جو کچھ سیکھ لیتا ہے وہ اپنی آئندہ کی ساری عمر میں بھی نہیں سیکھتا اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بچہ جتنی عمر لاشعوری کی حالت میں گزارتا ہے اس کی قوت مشاہدہ بہت قوی ہوتی ہے اور وہ اپنے گردوپیش ہر چیز اور ہر فعل کو اپنے شعور میں جذب کرتا ہے۔ بہرحال وہ سٹیج تو ابھی آگے آئے گی۔ البتہ یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ انسانی بچے کی تربیت اسی وقت سے شروع ہو جاتی ہے جب سے وہ اپنی ماں کے جسم میں غیر محسوس طور پر وارد ہوتا ہے اور اثرات قبول کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اگر اس کے وجود میں آنے کے وقت والدین کے خیالات پاکیزہ ماحول ستھرا اور خدا خوفی سے معمور ہو تو آنے والے پر اس کے خوشگوار اثرات ضرور پڑتے ہیں۔

اگر واقعی یہ بات سچ ہے جو تم لکھ رہی ہو تو پھر تیار ہو جاؤ کہ ہماری حقیقی قابلیت کی پرکھ کا وقت اب آ رہا ہے۔ بہرحال سب کچھ اللہ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے وہ جو چاہے کرے۔ اور جو چاہے اپنے بندوں پر فرائض عائد کرے۔ ہمارا حق تو یہی ہے کہ اس کے بندے بن کر رہیں اور جو فرائض وہ ہم پر عائد کرے ان کو اس کے بندے بن کر ہی اس کی مرضی کے مطابق ادا کریں۔

آنے والے پر ماں اور ماحول کے اثرات فوراً پڑنے شروع ہو جاتے ہیں اس لیے میں تم سے تاکیداً کہوں گا کہ ان دنوں قرآن مجید کا مطالعہ بلاناغہ جاری رکھو۔ یوں جیسے کسی کو پڑھ کر سنایا جا رہا ہو آہستہ آہستہ اس سے آنے والے پر اچھے

اثرات پڑتے ہیں - علامہ اقبالؒ ان دنوں میں خود قرآن مجید پڑھ پڑھ کر سنایا کرتے تھے - اِن دنوں میں نیک باتوں کی طرف خصوصاً متوجہ رہنا چاہیئے - صدقہ خیرات کا بھی اہتمام کرنا ضروری ہے - بُری باتوں کا تذکرہ نہ ہونے پائے اگر کوئی کرے تو اسے فوراً روک دیا جائے - اُجلے اور صاف ستھرے کپڑے پہنے جائیں ہلکی غذا کھائی جائے - نماز کی پابندی زیادہ سختی سے کی جائے - گویا اب ایک ایسا نمونہ بن جانا چاہیئے جو ایک نومولود نیک بچے کے سامنے پیش کرنا مطلوب ہو - ہمیشہ خوش رہنے کی کوشش بھی ضروری ہے بھئی اب چڑچڑاپن اور بدمزاجی سے تو ضرور ہی پرہیز کی جانی چاہیئے -

میری داڑھی کا پوچھتی ہو - تمہیں بہت دنوں کے بعد یاد آیا ہے - اب تو وہ گھٹنوں تک آگئی ہے - کیا خیال ہے ؟ یقیناً دسمبر میں مجھے بدلا ہوا پاؤ گی - لیکن زیادہ نہیں خفیف سا ابھی چھوٹی چھوٹی ٹھی اُگی ہے - بدلا گیا ہے دل تو وہی ہے - شکر ہے کہ اب شکل وصورت کے لحاظ سے بھی کچھ مسلمانوں کی طرح نظر آنے لگا ہوں -

اللہ سے خلوص کے ساتھ جو کچھ مانگو وہ دیتا ہے - لیکن مانگنے میں بھی بندگی کے ساتھ ساتھ وہ جذبہ ہونا چاہیئے کہ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے ؟ اور یہ تب ہی ہوتا ہے جب خود کو مکمل طور پر اُس کے تابع کر دیا جائے - ایک ناشکرا انسان بھی چیخ چلا کر وقت گزار دیتا ہے اور ایک شکر گزار صابر انسان بھی صبر کی سل دل پر رکھ کر اُس کی رحمت کا انتظار کرتا ہے لیکن قدر کے لائق اور انعام کا مستحق تو وہی ہے جو سہہ جائے اور اُف نہ کرے - پہلے اپنی رضا کو مالک کی رضا کے تابع کیا جائے پھر اس سے مانگا جائے تو وہ ضرور دیتا ہے - دینے کو تو وہ کافروں کو بھی دیتا ہے - اور ان کا حقِ پرورش ان کے حق سے بڑھ کر ادا کرتا ہے - پھر مومن کو کیوں نہ دے گا بشرطیکہ

مومن کا اخلاص ثابت ہو۔ مالک پر بھروسہ اعتماد اور توکل شرط لازم ہے۔ وہ اپنے بندوں کو انہی چیزوں کے ذریعے پرکھتا رہتا ہے اور جانچ پرکھ کر اور صبر کا امتحان لے کر ضرور دیتا ہے۔ مالک سے مایوسی گناہ ہے اس لیئے دعا کیے جاؤ۔ صبح اٹھ کر نماز کے بعد قرآن پاک بھی ضرور پڑھا کرو اور جس قدر پڑھو ترجمے کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ مالک سے جتنا زیادہ مانگا جائے وہ اتنا ہی زیادہ بندے سے خوش ہوتا ہے۔ دعا خود بھی عبادت ہے۔ اور یہ عبادت بہت ہی لذت انگیز ہے جو اپنی مرضی کے عین مطابق ہوتی ہے۔

نئی دہلی - ۲۵ , نومبر ۱۹۴۶ء

۴۶

بہت دنوں سے تمہارے خط کا انتظار کر رہا ہوں۔ موسم سرد ہو رہا ہے اور ملک میں فسادات کی گرمی بڑھ رہی ہے۔

تمہارے خط کا بہت انتظار کر کے یہ خط لکھ رہا ہوں۔ انتظار اور فراق دونوں کا مزاج یکساں ہے۔ اسی لیے تو کسی شاعر نے کہا تھا۔

ع مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت گزر جاتے ہیں

مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

ان دنوں دلی کا شہر ویران خرابہ بنا ہوا ہے جس میں مجھے ایک بھی متنفس

نظر نہیں آتا انسانوں کے ہجوم میں یہ شہر میرے لیے ایک ویرانہ بنا ہوا ہے اس لیے کہ تم مجھ سے کوسوں دور ہو۔

ے
تو جو نہیں میرے پاس شہر ہے ویراں تمام
تو ہو تو آباد ہیں اجڑے ہوئے کاخ و کو

یہ شہر ان دنوں میرے لیے دوزخ ہو رہا ہے لیکن حالات کی درستی کے لیے جو کچھ مطلوب ہے وہ ہمارے بس سے باہر ہے۔ بس ایک ہی درگاہ ہے جس کے سامنے گڑگڑایا جائے۔ ہر دکھ درد میں انسان کے سامنے صرف ایک ہی درگاہ رہ جاتی ہے جہاں سے اس کی امید کبھی شکست نہیں کھاتی اور وہ درگاہ پروردگار مطلق کی ہے جو روحوں کو پیدا کرتا ہے جسموں سے جوڑتا ہے اور پھر انہیں اپنی طرف واپس بلا لیتا ہے۔ وہی سب سے بڑا کارساز ہے وہی خالق و رازق و قادر و غفار و رحیم و کریم ہے۔ اس کی اطاعت ہم جتنی بھی کریں کم ہے۔ دعا کرو کہ ہمیں اپنی پاک راہ میں دکھ درد سے جان اور مال سے ہر قسم کی قربانی سے اگر آزمائے تو ثابت قدم رکھے۔ اسی کے ہاتھ میں ہی عزت ہے ہماری ہر استدعا اسی سے وابستہ ہے۔ یہ اسی کا کرم ہے کہ اس نے دنیا کے اس اندھیرے میں فہمِ دین کی روشنی دکھائی۔ دعا کرو کہ وہ ہمیں ثابت قدم رکھے۔ ہمیں راہِ حیات میں ڈگمگانے نہ دے۔ ہمیں انعمتَ علیہم میں سے کرے اور مغضوب علیہم سے بچائے۔ اسی کا رحم و کرم ہماری رگ رگ اور سانس سانس کی حفاظت اور پرورش کرتا ہے اور اس کے غضب سے ہم بھاگ کر کہیں جا نہیں سکتے۔ اسی کی خوشی ہمیں ہر رنگ میں مطلوب ہونی چاہیئے۔

رسول کریمؐ جب اداس یا پریشان ہوتے تو نماز پڑھنے لگ جایا کرتے تھے۔

پریشانیوں کا واحد علاج نماز اور یادِ خدا ہے۔ اس نسخے کو جب چاہو آزما دیکھو۔ بڑا تیر بہدف نسخہ ہے۔ نماز میں کھڑا ہو کر اللہ کا بندہ اپنے رب سے یہ عہد کرتا ہے "الٰہی ہم تیرے ہی بندے ہیں۔ ہمیں اپنی راہ پر قائم رکھ اور ہمیں سچا مسلمان بنا" لیکن جب مسلمان اقامتِ دین کا جھنڈا اٹھاتا ہے تو گویا وہ اس عہد کو پورا کرنے کے لیے نکلتا ہے جو اس نے اپنے اللہ سے نماز میں کیا ہوتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اقامتِ دین کی جدوجہد خود ایک افضل عبادت ہے۔ اسی لیے شہیدوں کے مرتبے بہت بلند رکھے گئے ہیں اس لیے کہ وہ اللہ کی راہ میں جان دیتے ہیں۔ موجودہ اسلامی تحریک چونکہ اقامتِ دین کی جدوجہد کر رہی ہے اور انبیاء کے طریقے پر کر رہی ہے جس میں نہ اشتہاری پروپیگنڈہ ہے نہ مفادات اور مناصب کے ذریعے قومی خدمت ہے اور نہ ہی نظامِ باطل سے عملی تعاون ہے اس صورت میں اس تحریک کے ساتھ مل کر ہم جو جدوجہد بھی کریں وہ اقامتِ دین کی جدوجہد ہے۔ اس جدوجہد کے بھی مختلف درجے ہیں۔ ابھی تو لوگوں میں اسلام کی رُوح پھونکنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ انہیں اسلام کا مقصد سمجھایا جا رہا ہے۔ ان کی رگوں میں سے غفلت نکال کر اسلام کا درد بھرا جا رہا ہے۔ لٹریچر کی خاموش زبان سے اور تبلیغ کی عملی کوششوں سے آہستہ آہستہ جب یہ تحریک اس مرحلے پر پہنچے گی کہ نظامِ باطل کو چیلنج دے سکے تو پھر جہاد کے لیے تلوار اور ہتھیار کی باری بھی آ سکتی ہے اُس وقت اسی سے کام لیا جائے گا لیکن جس طرح کسی منزل کی طرف جاتے ہوئے ہم پہلے قدم کو بھی اسی منزل کا قدم کہتے ہیں اور آخری قدم کو بھی اسی منزل کا قدم کہتے ہیں اسی طرح اقامتِ دین کی جدوجہد میں پہلی چھوٹی سی کوشش کو بھی اللہ کی راہ کا کام کہا جاتا ہے اور سر کٹانے کے وقت کو بھی اللہ کی راہ کا کام ہی کہا جاتا ہے۔ جس طرح مکہ شریف میں مصیبتیں اٹھاتے پتھر کھاتے اور سب مخالفتوں کے وقت بھی رسالت کا پیغام

اور اسلام کی ہی دعوت تھی اور فتح مکہ کے بعد جب دنیا پر مسلمان چھا رہے تھے تب بھی اسلام کی ہی دعوت تھی۔

ایک نیک کام کو دوسرے نیک کام سے تشبیہ دینا بُرا نہیں ہے۔ کم از کم میرے نزدیک تو اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ حج بھی اللہ کا حکم ہے اور اقامتِ دین بھی اللہ کا ہی حکم ہے۔ حج کی تو انگریزوں نے آج اجازت دے رکھی ہے اس لیے ہم کر لیتے ہیں اگر کل وہ بند کر دیں تو پھر کون کرنے جائے گا۔ جنگ عظیم میں ہمارے لیے دو سال حج بند رہا تو کون کرنے گیا تھا۔ لیکن اقامتِ دین وہ عظیم عبادت ہے جو نظام باطل کو گراتی ہے اور دین کے ارکان کی بے بسی اور مسکینی کو ختم کر کے انہیں عزت کا صحیح مقام دیتی ہے۔ آج ہم ہی غلام نہیں ہیں ہمارے ساتھ ہماری نمازیں ہمارے روزے ہماری زکوٰۃ۔ ہمارے حج سب غلام ہیں۔ ہمیں شرم آنی چاہیئے کہ اللہ پاک کے حضور میں اپنی وہ نمازیں کس طرح پیش کریں گے جو کافروں نے رحم کھا کر ہمیں ازراہِ فراخدلی پڑھنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ ہم اس کے سامنے اپنی حرام کمائیوں کی زکوٰۃ پیش کرتے ہیں۔ حرام کمائیوں سے حج کرتے ہیں خیراتیں دیتے ہیں۔ جن زبانوں سے دوسروں کی حکمرانی کا دم بھرتے ہیں ان زبانوں سے ہی اللہ کا پاک نام بھی لیتے ہیں اور شرم سے مر نہیں جاتے کہ اس ذات پاک کے ساتھ ہمارا مذاق کیا رنگ لائے گا اس لیے کہ ہم پر بحیثیت مسلمان یہ لازم ہے کہ اللہ کی حکومت قائم کریں۔ غلامانہ عبادتیں بلند و برتر ذات پاک کے حضور میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ اقامتِ دین کی منزل تو وہ منزل ہے جس کا آخری مرحلہ انسان سر دے کر طے کرتا ہے اور ایک ہی بار سر دے کر اس کی ساری خطائیں معاف ہو جاتی ہیں۔ سر دے کر جو عبادت کی جاتی ہے اس کا کوئی جواب بجز جنت نہیں ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ تم نیکی اور بدی کو ٹٹول ٹٹول کر اور سوچ سمجھ کر اختیار کرنے کی قائل ہو۔ مومن کا دین

عقل و فہم کا دین ہے بے اندھی تقلید نہیں ہے۔ اب بس کرتا ہوں اور تمہاری خیریت کا طالب ہوں۔

نئی دہلی۔ ۲، دسمبر ۱۹۴۶ء

---

(۴۷)

کل تمہارا خط ملا۔ تم نے مرد عورت کے باہمی تعلق کے بارے میں دلچسپ موضوع چھیڑ دیا ہے۔ بلاشبہ مرد اور عورت اپنی اپنی جگہ پر مکمل وجود ہیں لیکن اجتماعی حیثیت سے دونوں کا وجود علیحدہ علیحدہ طور پر نامکمل ہے۔ عورت اپنے دائرۂ نسائیت کے اندر مکمل ہے اور مرد اپنے دائرہ رجولیت کے اندر مکمل ہے۔ لیکن جونہی وہ ان دونوں دائروں سے نکل کر تمدنی معاشرتی اور اجتماعی زندگی کی طرف آتے ہیں تو اجتماعی حیثیت اختیار کرنے کے لیے دونوں علیحدہ علیحدہ نامکمل وجود بن جاتے ہیں پھر وہ دونوں مل کر ہی اجتماعی جسامت کو مکمل کرتے ہیں دونوں کا جوڑا ہی ایک مکمل وجود بنتا ہے۔ دونوں میں سے کوئی ایک تنہا اس اجتماعی جوڑے کے وجود کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ مرد عورت کے بغیر ایک نامکمل اجتماعی وجود ہے اور عورت مرد کے بغیر ایک نامکمل اجتماعی وجود ہے۔ اس لیے یہ تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ کوئی تنہا اپنے علیحدہ وجود کے زور سے اجتماعی زندگی کی گاڑی کھینچ کر لے جائے۔

اس اجتماعی وجود کی مثال پانی سے لے لو۔ پانی ایک طبعی مرکب ہے۔ آکسیجن اور ہائیڈروجن سے اب پانی بذات خود ایک اجتماعی وجود ہے۔ نہ صرف آکسیجن کو پانی کہا جا سکتا ہے

اور نہ ہی ہائیڈروجن کو پانی کہا جا سکتا ہے بلکہ دونوں مل کر ہی پانی تیار کرتی ہیں۔ جب وہ پانی کی شکل میں آئیں تب ان کا وجود ایک مکمل اجتماعی وجود بنتا ہے۔ لیکن علیحدہ علیحدہ وہ دو ہوائیں ہیں اور اپنے الگ الگ خواص رکھتی ہیں۔ آکسیجن بھاری ہوتی ہے ہائیڈروجن ہلکی ہوتی ہیں۔ آکسیجن آگ بھڑکاتی ہے ہائیڈروجن آگ بجھاتی ہے۔ آکسیجن کا جز کم ہوتا ہے۔ ہائیڈروجن کا جز و زیادہ ہوتا ہے۔ یہ دونوں ہوائیں اپنے علیحدہ علیحدہ خواص رکھنے کے باوجود پانی کی صورت میں تنہا تنہا نامکمل ہیں اور مل جل کر مکمل ہو جاتی ہیں۔ یہی کیفیت میاں بیوی کی ہے۔ میاں کے خواصِ طبعی اور قسم کے ہیں بیوی کے اور قسم کے ہیں۔ بیرونی معاملات میں مرد کا وجود ذرا وزنی ہوتا ہے۔ عورت کا ذرا ہلکا ہوتا ہے۔ گھریلو معاملات میں مرد کا جزو ذرا کم ہوتا ہے۔ عورت کا ذرا زیادہ ہوتا ہے۔ بس اسی طرح اجتماعی زندگی کا ایک ابتدائی یونٹ وجود میں آجاتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ تم اس سوچ بچار میں زیادہ وقت صرف نہیں کرو گی اور ذہن کو ہلکے پھلکے خیالات کی طرف موڑو گی۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ تم اس بحث میں اس لیے الجھی ہوئی ہو کہ میری طرف سے مکان کی کوشش میں تاخیر ہو رہی ہے اور تم دہلی آنے کے لیے پا بر رکاب ہو۔

نئی دہلی۔ ۱۱، دسمبر ۴۶ء

۴۸

کئی دنوں سے چُپ ہو آخر کیا بات ہے۔ شاید مکان حاصل کرنے میں تاخیر کی کوتاہی سے روٹھی ہوئی بیٹھی ہو۔ آج تیسرے دن سے میں خود بھی کچھ مضمحل سا ہوں۔ جسم تھکا تھکا سا ہے شاید بخار ہے یا آنے والا ہے

آج آسمان پر ابر سا چھا رہا ہے۔ راشن کارڈ نئے بنوائے تھے اس سلسلے میں آج دفتر بھی بارہ بجے سے پہلے نہ جا سکا۔ یہاں تو کم بخت ہر چیز راشن کر دی گئی ہے۔ اس لیے راشن کارڈ کے بغیر یہاں زندہ رہنا بھی مشکل ہے۔

آج کل ایک کتاب کسی مصری عالم "فرید ی وجدی" کی لکھی ہوئی پڑھ رہا ہوں۔ جس کا ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا ہے۔ کتاب کا نام "مسلمان عورت" ہے کتاب پردے سے متعلق ہے اور مغرب سے مرعوب ہو کر مشرق وسطےٰ میں جو نمایاں معاشرتی تبدیلیاں ہو رہی ہیں ان پر بڑی پر لطف بحث کی گئی ہے۔ تم آؤ گی تو یہ کتاب دیکھنا میرا خیال ہے کہ تمہیں پسند آئے گی۔ ہر خط میں اپنی صحت کے متعلق تفصیلی رپورٹ لکھتی رہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ مجھے یقین ہے کہ اب تمہیں بھی اس معاملے میں کامل یقین ہو چکا ہو گا اور مجھے بھی یقین ہے کہ ایسا ہی ہو گا۔ اب خدا ہمیں اس کی ذمہ داریوں کو اچھے طریقے سے نبھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ مبارک ہو......۔ سنتی ہو یہاں آؤ گی تو اس خوشی میں دونوں مل کر مٹھائی کھائیں گے۔ تم مجھے پارٹی دینا اور میں تمہیں دوں گا۔ ٹھیک ہے نا۔ اب خدا کرے کہ باقی عرصہ بخیر و عافیت گزر جائے۔ اللہ پاک سے

ہمیں ہر بہتری کی توقع ہے۔

اب تم خود ہی نماز نہیں پڑھتی ہو بلکہ ایک لاشعوری وجود کو بھی اپنے ساتھ نماز پڑھاتی ہو۔ اب تم خود ہی قرآن مجید کی تلاوت نہیں کرتی ہو بلکہ ایک موہوم سی ہستی کو بھی اپنے ساتھ سناتی ہو۔ اب تم خود ہی نیکی کے خیالات اور مسرت کے جذبات نہیں رکھتی ہو بلکہ اس کی لہریں ایک محفوظ وجود تک بھی پہنچاتی ہو۔ غرض اب تمہارے خیالات احساسات اور حالات کا پورا پورا عکس کہیں اور بھی پڑتا ہے۔ گویا ایک نامعلوم وجود کی تربیت شروع ہو چکی ہے۔ اب تو تم باقاعدہ قدرت کے سکول میں معلمہ بن چکیں۔ اب تمہاری ہر حرکت کو نمونۂ عمل بننا ہو گا ورنہ تمہارے زیر تربیت ہستی خام رہ جائے گی۔ دیکھو کتنا مشکل مرحلہ ہے جو عورتوں کے ذمے قدرت نے لگایا ہے۔ بخدا ظالم اور لعنتی ہیں وہ لوگ جو ان کاموں کے ساتھ ساتھ عورتوں سے دنیاوی کاروبار اور دفتر و کارخانہ میں بھی کام لیتے ہیں۔ قدرت نے خود عورت کے ذمے اتنے کام لگا دیئے ہیں کہ وہ بیچاری ان کو ہی بمشکل ادا کر سکتی ہے کجا یہ کہ اس سے زبردستی دوسرے کام لیے جائیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے ان لوگوں پر جو آزادیٔ نسواں کے دلفریب لفظ کی مدد سے عورتوں سے دوہرا کام لینا چاہتے ہیں کاروباری بھی اور معاشرتی بھی۔ بیرونی بھی اور اندرونی بھی۔ کتنا بڑا فریب ہے یہ۔ فریب کار ہیں یہ لوگ۔

لو خوشخبری سن لو۔ میرے رفیق ممتاز حسین صاحب نے اپنے مکان کے اوپر کا حصہ مجھے کرائے پر دے دیا ہے۔ یہ مکان شہر میں کوچہ پنڈت کے پاس محلہ گھوسیاں میں ہے۔ ابھی ابھی ان کی طرف سے پیغام آیا ہے۔ میں نے وہ مکان دیکھا ہوا ہے۔ ہماری مختصر سی ضروریات کو وہ پورا کر سکتا ہے۔ آج ہی ارادہ ہے کہ سامان اٹھا کر وہاں منتقل

ہو جاؤں تاکہ مکان اور سامان درست کر کے تمہیں دہلی لانے کی فکر کر دوں۔ بس اب سمجھ لو کہ اس دوسری جدائی کا وقفہ بھی ختم ہوا اور میں منتقل ہونے ہی ضروری تیاریاں کر کے تمہیں لانے کیلئے لدھیانہ پہنچنے والا ہوں۔ بتاؤ اب تو خوش ہو!

نئی دہلی۔ ۱۵ر دسمبر ۴۶ء

(۴۹)

نئے مکان میں منتقل ہو چکا ہوں۔ یہ چھوٹا سا مکان خوب ہے بیت الخلاء موجود ہے اور غسل خانہ میں نے خود ہی بنوا لیا ہے۔ اب نئے مکان میں ہی بیٹھا ہوا تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔

آج اتوار کا دن ہے۔ اس وقت ساڑھے تین بجے ہیں۔ ادھر ادھر کے آنے جانے والوں کی کھینچا تانی سے بچ کر مشکل سے یکسو ہو کر بیٹھا ہوں۔ آج خوب بد پرہیزی کی گئی ہے۔ احباب کی طرف سے شادی کی مٹھائی کے تقاضے اب تک چل رہے ہیں بیچارے یہ نہیں جانتے کہ اب کوئی دوسری مٹھائی بھی تیار ہو رہی ہے بہر حال میں نے مٹھائی پارٹی کی بجائے فروٹ پارٹی مان لی تھی۔ چنانچہ فروٹ پارٹی خوب رہی۔ احباب کو تو کھلانے کھلانے کا مشغلہ چاہیئے۔ آج یہاں دن بھر بوندا باندی جاری رہی ہے۔ موسم بہت خوشگوار ہو گیا ہے۔

اب سرکاری مکانوں کے عبور دریائے شور سے رہائی مل گئی ہے خدا کا شکر

ہے۔ موجودہ مکان جو میں نے لیا ہے یہ جگہ وہاں سے گندی ہے، کم ہوادار ہے کم روشن ہے، تنگ بھی ہے لیکن بہرحال شہر میں ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اب یہی مکان رہائش کے لیے طے کر لیا گیا ہے۔ ۲۴ دسمبر کو پہلی چھٹی ہے۔ ۲۳ کی رات کو یہاں سے روانہ ہو کر انشاء اللہ ۲۴ کی صبح کو وہاں پہنچوں گا۔ تم تیار رہو تو اسی دن گیارہ بجے کی گاڑی سے واپسی کی روانگی ہو سکتی ہے ہم واپس اپنے آشیانے میں رات تک پہنچ سکتے ہیں۔

امی جان تو غالباً اسی ماہ کے تیسرے ہفتے میں گاؤں جائیں گی۔ وہاں وہ کتنے دن رہنے کا پروگرام رکھتی ہیں؟

مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ تم نے قرآن مجید کا بلاناغہ مطالعہ شروع کر رکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں چاہے کم سے کم ہی کیوں نہ ہو لیکن مطالعۂ قرآن ضرور ہونا چاہیئے۔ اس سے انسان کے ذہن اور طبیعت پر بہت اچھے اثرات پڑتے ہیں اور ساتھ ہی ہمیں ان احکام کی خبر بھی ملتی رہتی ہے جو آقا نے اپنے بندوں کو دیئے ہیں۔ علامہ اقبال کے والد محترم نے نصیحت کی تھی کہ "بیٹا قرآن مجید جب پڑھو تو یہ نہ سمجھو کہ آج سے تیرہ سو سال پہلے کی یہ ایک کتاب ہے بلکہ یہ سمجھو کہ قرآن تمہارے لیے ہی اترا ہے اور تم ہی اس کے مخاطب ہو" میرے خیال میں قرآن مجید کی صحیح روح تک پہنچنے کے لیے اس سے بہتر کوئی تعبیر نہیں ہو سکتی۔ جب انسان کے دل میں یہ بیٹھ جائے کہ یہ احکامات براہ راست اسے ہی دیئے جا رہے ہیں اور وہ سب اس کے اپنے مالک کی طرف سے ہیں تو انسان ان سے پہلو تہی نہیں کر سکتا۔

رات چند ایک شاعروں نے گھیر لیا۔ شاعر ایک ایسا ذی روح ہے جو آہ - واہ

دل - جگر - غم - غصّہ - ہجر - وصال وغیرہ کھاتا ہے اور شعر اگلتا ہے اس کا اپنا نہ دل ہوتا ہے نہ دماغ نہ پیٹ صرف زبان ہوتی ہے جو موقع بے موقع اشعار بولتی جاتی ہے۔ اور کان ہوتے ہیں جو داد کے لیے کھلے رہتے ہیں۔ اس کی سب سے مرغوب غذا داد ہے۔ جہاں اسے یہ مل جائے وہاں سے وہ نہیں ہلتا۔ اور یہی میرے پاس اس سے پناہ کا ہتھیار ہے جونہی کبھی وہ جتھا بنا کر مجھ پر حملہ آور ہوتے ہیں تو بے داد کے وار سے میں انہیں بھگاتا ہوں لیکن انہیں اگر اتنا معلوم ہو جائے کہ سننے والا شخص سخن شناس بھی ہے اور اس کی معمولی داد بھی سخن ناشناسوں کی داد سے زیادہ قیمتی ہے تو پھر ان پر بے داد کا ہتھیار بھی کام نہیں کرتا اور وہ ارشاد کر کرکے اس شخص کا بھیجا صاف نگل جاتے ہیں۔ رات میں ایسے نرغے میں پھنس گیا تھا۔ کچھ شاعروں کو معلوم ہو گیا کہ میں بھی کچھ تھوڑا سا ادبی ذوق رکھتا ہوں۔ اب ظاہر ہے کہ ان کے لیے ایسے شخص سے بڑھ کر مرغوب اور کون سا شکار ہو سکتا ہے۔ میں اگرچہ داد بہت کم دیتا ہوں بلکہ الٹا تنقید کرتا ہوں جس سے یہ مخلوق بہت جھنجلاتی اور پھڑ پھڑاتی ہے۔ معذرتیں پیش کرتے ہیں جلدی سے کوئی دوسرا شعر پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن میں دُم نہیں چھوڑتا اس طرح سے ان شعراء کرام کی تواضع کی جاتی ہے لیکن وہ بھی کچھ ایسے صاحبِ ذوق لوگ ہوتے ہیں کہ داد کی امید میں پھر بھی لپک لپک کر آتے ہیں۔ جب ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ داد طلب نظروں سے دیکھ دیکھ کر شعر پڑھتے ہیں اخلاقاً بھی کچھ نہ کچھ داد دینی لازم ہو جاتی ہے اگرچہ مجھے اب اقبال کے سوا کسی کی شاعری پسند نہیں ہے۔

ہاں تو دوبارہ سن لو کہ میں ۲۴ دسمبر کو تمہیں لینے کے لیے لدھیانہ پہنچ رہا ہوں۔ بس تیار رہو۔ ؎ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔

دلی پہاڑ گنج - ۱۲ دسمبر ۱۹۴۶ء

لمحاتِ فراق

۵۰

کئی ماہ کی رفاقت کے بعد تمہیں واپس پہنچا کر اب میں پھر اسی ماحول میں آگیا ہوں جہاں میں اور تم کئی مہینے اکٹھے رہے ہیں۔ وہی سب چیزیں ہیں وہی ہمسائے ہیں۔ وہی ماحول ہے وہی نیم کا درخت ہے اور وہی چاروں طرف دودھ والوں کے مکانات ہیں۔ ہر چیز وہی ہے۔ مکان کی چیزیں وہی ہیں لیکن جیسے ایک بے روح جسم ہے جس کی "جان" نکل گئی ہو۔ ماحول کی یہ ساری اداسی تمہاری عدم موجودگی کی یاد دلاتی ہے۔ جیسے یہاں ہر چیز اداس مضمحل اور گم صم ہو کر رہ گئی ہے۔

کمرے میں جو چیزیں جس ترتیب سے تم نے رکھی تھیں وہ اسی ترتیب سے پڑی ہیں جس ترتیب سے تم نے رکھی تھیں۔ مکان میں آیا تو ہر چیز پر انچ انچ گرد جمی ہوئی تھی۔ ہمارے بعد دہلی میں آندھی آئی تھی جس سے سارا مکان گرد میں اٹ گیا تھا۔ ملک بھر میں بھی فسادات کی آندھی آئی ہوئی ہے جس سے سارے ملک کا دامن خون آلود ہو رہا ہے اور یہ کام وہ لوگ کر رہے ہیں جنہیں ایک قومی نظریئے کا دعوٰی ہے گویا مار مار کر ایک قوم تیار کی جا رہی ہے۔ یکجان ہونے کا کیسا عجیب نسخہ ایجاد کیا گیا ہے۔

ان دنوں دفتر میں ہندوؤں سکھوں سے اسلامی حکومت کے تصور پر بحثیں ہوتی رہتی ہیں۔ میں نے خلافت راشدہ کا تصور پیش کیا تو ایک صاحب لال سنگھ نامی جو میرے دفتر کے ساتھی ہیں کہنے لگے اگر تم لوگ کوئی ایسا معاشرہ قائم کر دو جس کا تم بار بار ذکر

کرتے ہو تو میں ہندوستان چھوڑ کر اس اسلامی حکومت میں رہنے کو زیادہ ترجیح دوں گا۔ تم کوئی ایسا معاشرہ قائم کر کے تو دکھاؤ۔ میں نے کہا پاکستان اسی مقصد کے لیے وجود میں لایا جارہا ہے۔ لیکن۔ جان..... سچ پوچھو تو کبھی کبھی دل میں بڑی کھٹک ہوتی ہے جو لوگ آج پاکستان کا نعرہ لگا رہے ہیں کیا یہ واقعی خلافت راشدہ کی طرز کی اسلامی حکومت قائم کر دیں گے۔ کر بھی سکیں گے؟ مجھے تو اس میں بڑا شک ہے۔ بس اللہ سے خیر کی دعا ہی کرو۔

محلہ گھوسیاں۔ دہلی۔ ۱۹ رمئی ۴۷ء

۵۱

دہلی میں رفاقت کے سارے ایام محبت کے ساتھ گزر گئے دکھ بھی راحت بن گئے اور اب تم واپس چلی گئی ہو تو اور زیادہ شدت سے یاد آرہی ہو۔

تم حیران ہو گی یہ خط میں تمہیں پھلور سے لکھ رہا ہوں۔ جی ہاں دو دن کی چھٹی لے کر یہاں آیا ہوں۔ یہاں میرے ایک عزیز دوست چوہدری علی احمد خان ہیں پہلے پولیس میں سب انسپکٹر تھے پھر طاغوت کی چاکری پر لات ماری اور اب ایک چھوٹا سا ہوٹل کھول لیا ہے۔ تم جانتی ہو کہ میں بھی فرنگی کی چاکری کو حرام سمجھتا ہوں۔ ہم اس سلسلے میں بہت باتیں کر چکے ہیں۔ بھائی جان سے مشورہ کیا تھا وہ میری رائے سے اتفاق کرتے ہیں چنانچہ ان سے مشورہ کے بعد میں جالندھر سے چلا آیا ہوں۔ چوہدری صاحب

نے مجھے کئی ایک دکانیں دکھائی ہیں، سوچ رہا ہوں کہ حرام کی چپڑی ہوئی روٹی کی بجائے حلال کی روکھی سوکھی آدھی روٹی ہی کافی ہو گی۔

مجھے معلوم ہے کہ دبے دبے الفاظ میں تم ملازمت ترک کرنے کی مخالف ہو چنانچہ تمہارا خیال بھی بار بار آ رہا ہے۔ ابتدائے عاشقی میں ہی تمہیں امتحان میں ڈال رہا ہوں اس امید پر کہ تم عُسرت میں بھی میری رفاقت کو ترجیح دو گی۔ اس لیے کہ اب تمہیں اپنے آپ سے الگ کر کے سوچنا بھی میرے لیے مشکل ہے اور میں اب کچھ نئی مشکلات کو دعوتِ مبارزت دے رہا ہوں۔

تم کیا سمجھیں کہ یہ سب کچھ کس سلسلے میں ہے۔ میں اپنی ملازمت کی نعش کے تابوت میں آخری کیل لگانے کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ اس وقت دُکان کا ملنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ بڑے شہروں پر عذابِ فساد نازل ہو رہا ہے۔ ایک طرف ملک کی قسمت کا فیصلہ سر پر آ گیا ہے۔ دوسری طرف میں اپنی معاش کے گھوڑے کا رخ بدل رہا ہوں جو عین منجدھار میں جا رہا ہے اور حال یہ ہے کہ نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں۔ مالک سے بہت سی امیدوں اور توقعات کے ساتھ میں طاغوت کی خدائی کے خلاف خاموش بغاوت کا علم بلند کر رہا ہوں اور تم میرے ساتھ ساتھ ہو۔ خدا کرے کہ صبر و رضا سے یہ مرحلہ تم گزار لے جاؤ۔ خدا حافظ۔

پھلور۔ ۲۴، مئی ۱۹۴۷ء

۵۲

ابھی ابھی تمہارا خط آیا ہے۔ منتظر آنکھوں اور مضطرب دِل کے لیے ابرِ محبت بن کر آیا ہے۔ دہلی میں فسادات ان دنوں ختم ہو گئے ہیں لیکن گرمی حبس اور تنہائی نے سارا شہر ویران کر رکھا ہے۔ واپسی کے لیے تیاریاں کر رہا ہوں اور جو دن یہاں گزر رہے ہیں یہ باقیماندہ دن اب گھنٹوں اور منٹوں میں تقسیم ہو گئے ہیں اور ہر گھنٹہ اور منٹ دنوں اور مہینوں کا طول رکھتا ہے۔ وقت کی رفتار کی تیزی اور سستی کا انحصار بھی خارجی حالات پر ہے جیسے ہم کسی تکلیف میں مبتلا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دن کبھی نہ گزریں گے اور اگر آرام و عشرت ہو تو گزرتے ہوئے پتہ ہی نہیں چلتا۔ اسی لیے تو حسرت نے کہا تھا

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت گزرے جاتے ہیں۔
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں۔

میں اب مطمئن ہوں کہ تمہیں اسلام کے متعلق کافی صاف ستھری اور پاکیزہ معلومات حاصل ہو گئی ہیں اور ان معلومات پر تمہیں یقین و ایمان بھی مکمل اور پختہ حاصل ہے۔ پھر اب تم اپنے خیالات کا اظہار بھی پوری صفائی سے کر سکتی ہو۔ اس صورت میں تمہیں چاہیئے کہ اپنے اہل خانہ اور گرد و پیش کو اسلام کے صحیح اصولوں سے روشناس کراتی رہو۔ اللہ پاک نے اپنے نبیؐ کو مذہبی جھگڑے پیدا کرنے کے لیے تو نہیں بھیجا تھا جو اللہ کے دین کو شریعت طریقت اور حقیقت کے کھاتوں میں تقسیم کرے۔ بلکہ نبیؐ نے تو لوگوں کو صرف اللہ کی بندگی کی طرف ہی بلایا تھا جو لوگ اسلام کی اصولی تعلیمات کو پس پشت پھینک کر ایسی باتوں

میں الجھتے ہیں جن کا اسلام کی اصولی تعلیمات سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے ایسے لوگ اسلام کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے چاہے وہ کسی غلط فہمی کی بنا پر ایسے ہوں یا جان بوجھ کر۔ میری تو دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ بے دینوں کو ہی نہیں بلکہ دینداروں کو بھی اسلام کی اصلی تعلیمات اور اس کے حقیقی تقاضوں کو سمجھنے اور پورا کرنے کی توفیق بخشے اور شیطانی پھندوں سے اپنے بندوں کو نجات دے۔

اب آخری فیصلہ ہو گیا ہے کہ ملازمت چھوڑ دینی ہے پھلور سے چوہدری صاحب نے لکھا ہے کہ انہوں نے میرے لیے ایک دکان طے کر لی ہے میں نے بھی استعفےٰ لکھ کر دیا ہے اور دکان کا سامان اپنے بعض تاجر احباب کے مشورے سے خریدنا شروع کر دیا ہے۔ میرے لیے دعا کرو۔

سلمیٰ سے کہنا نماز باقاعدگی سے پڑھتی رہے۔ اس دنیا کے امتحانات تو فیل ہونے کی صورت میں دوبارہ محنت کر کے پاس کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن آخری امتحان میں اگر کوئی فیل ہو جائے تو یہاں دنیا کا کوئی امتحان بھی وہاں کام نہ آئے گا۔ اور دوبارہ مہلت بھی نہ ملے گی۔ اسے رسالہ دینیات اور خطبات ضرور پڑھنے کے لیے دو۔ بزرگوں کی عادت تو برسوں کی پختہ عادت ہوتی ہے چھوٹتے چھوٹتے ہی چھوٹتی ہے۔ اللہ تعالےٰ اپنے بندوں کو سچے عمل اور اپنی سیدھی راہ کی طرف راہنمائی عطا فرمائے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ فرقہ بندیوں اور چھوٹی چھوٹی باتوں کے جھگڑوں میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ اسلام عنقریب مسلمانوں سے قربانیاں طلب کرنے والا ہے ہمیں اس کے لیے اپنے آپ کو بھی سے اہل بنانا چاہیے۔ مسلمان کا کام سیدھی سادھی نیکی کی تلقین اور برائی سے روکنا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایمان کا پہلا درجہ برائی کو قوت سے روک دینا ہے۔

اور دوسرا درجہ اس کے خلاف زبان سے جہاد کرنا ہے اور تیسرا گھٹیا درجہ اسے دل ہی دل میں بُرا سمجھنا ہے پہلے درجہ میں مسلمان اسلامی حکومت قائم کر کے ہی داخل ہو سکتے ہیں لیکن ہمیں اپنے آپ کو دوسرے درجے سے تو نیچے نہیں گرنے دینا چاہیئے۔ نماز کی چھوٹی بچیوں کو تاکید کیا کرو وہ پڑھیں نہ پڑھیں تم اپنا فریضۂ تبلیغ ادا کرتی رہا کرو۔ کبھی سب کو بٹھا کر خطبات میں سے کوئی خطبہ ہی سنا دیا کرو ایک مومنہ کی حیثیت سے تمہیں یہ تھوڑا ہی دیکھنا ہے کہ دوسرے کیا کرتے ہیں دیکھنا تو یہ ہے کہ خدا کی طرف سے ہمارے ذمے کیا ہے بس تمہیں تو اپنے ذمے کا فرض ادا کرنا چاہیئے"

دہلی۔ محلہ گھوسیاں - ۲۶ مئی ۴۷ء

۵۳

تمہارا خط ملا۔ خشک دھانوں میں جیسے برکھا کا پانی پڑ گیا۔ تم نے مجھے کم نویسی کا الزام دیا ہے تمہاری ہر شکایت بسر و چشم قبول ہے۔ آخر ہم نے یہ مقدمہ کسی قاضی کے سامنے تھوڑا ہی رکھنا ہے۔ تم نے الزام لگایا چلو ہم نے قبول کر لیا

میں بے حد خوش ہوں کہ تم نے خاتون مذکور سے صاف صاف باتیں کر لیں۔ میں تو اسی بات کا قائل ہوں جب تک کوئی سمجھنا چاہے سمجھانے کی کوشش کی جائے۔ کوئی شخص غلط فہمیوں میں مبتلا ہو تو غلط فہمیاں رفع کی جائیں لیکن اگر ہٹ دھرمی دکھائے اور بدنیتی سے الزام بازی کرے تو اس کی طبیعت ایسی صاف کی جائے کہ اسے بھی لطف آجائے۔ بات کھری اور

سچی ہو۔ حق گوئی میں کسی کا ڈر نہ ہو۔ بس تنقید جائز اور اخلاقی طور پر درست ہو۔ تم نے بہت اچھا کیا جو اس کے خیالات کو درست کر دیا۔ یہ تم نے بالکل ٹھیک کہا کہ جو شخص کم گو اور شریف ہو لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ بزدل ہے اور ان سے ڈرتا ہے حالانکہ جو شریف اور راست رو ہو اس سے زیادہ دلیر کوئی نہیں ہوتا وہ اپنی غلطی ماننے میں بھی دلیر ہوتا ہے اور دوسروں کی غلطی واضح کرنے میں بھی کسی سے نہیں ڈرتا۔ اسی کا نام تو اعلائے کلمۃ الحق ہے اور جو شخص ایسا ہو اس کے کردار کا رعب اور وقار خود بخود دوسروں پر قائم ہو جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارا رویہ گفتگو میں سچائی اور حقیقت کا ہی رہا ہوگا اور تم نے وہی بات واضح کرنے کی کوشش کی ہو گی جو اپنی جگہ پر درست ٹھوس اور اصل ہو گی۔

جاہلیت کے رویے کا اثر ہمیشہ قائم نہیں رہا کرتا۔ قرآن کے اصول کے مطابق جب حق آجاتا ہے تو باطل ہوا ہو جاتا ہے اس لیے کہ باطل حق کے آگے ٹھہر نہیں سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ ہمارا اخلاق ہمارا کریکٹر اور ہمارا میل جول ہماری گفتگو ہمارا رویہ اور ہمارا معاملہ لوگوں پر سورج کی طرح واضح ہو جائے اور کسی کو ہمارے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ رہے۔ پھر بدنیتی سے کوئی شخص جو چاہے کہتا رہے۔ ہمارے معاملات سب کے ساتھ سچائی اور نیکی پر مبنی ہوں۔ جو برا ہو اسے برا ہی کہا جائے اور اس کی برائی اس پر واضح بھی کی جائے چاہے وہ کتنا ہی بلند مقام پر بیٹھا ہو اور جو اچھا ہو اسے اچھا ہی کہا جائے چاہے لوگوں کی نظر میں وہ کتنا ہی معمولی اور حقیر ہو۔ یہی معیارِ حق ہے۔ امید ہے کہ تم نے سب پر اپنا مسلک پوری طرح واضح کر دیا ہوگا۔ ہم اچھوں کی قدر کرتے ہیں اور ان کی عزت کرتے ہیں ہم بُروں کو برا ہی سمجھتے ہیں اور یہ یاد رہے کہ ان سے ڈرتے ہم ہرگز نہیں ہیں چاہے ان کی مادی طاقت کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ میں خوش ہوں کہ تم نے ان پر اپنی اخلاقی قوت واضح کر دی ہے یہ بڑا کام ہوتا ہے

کہ کسی بُرے کی بُرائی اس کے منہ پر عمدگی سے واضح کردی جائے۔

ایک شخص کا اسی وقت تک وقار ہوتا ہے جب تک وہ راستی پر رہتا ہے اور اس کی بات مانی جاتی ہے جب وہ راستی سے ہٹ گیا اس کا وقار بھی اٹھ گیا تو پھر اس کے لیے چارہ نہیں کہ یا تو وہ سیدھی راہ پر آجائے یا معاملات میں دخل دینے سے ہٹ کر الگ تھلگ ہو جائے۔ جو لوگ خدا سے بے خوف ہوں۔ کسی کے ہمدرد نہ ہوں نیکی کی طرف راغب نہ ہوں سچائی کو پسند نہ کرتے ہوں جن کی فطرت میں ٹیڑھ ہو جن کے معاملات غیر شریفانہ ہوں ان میں آخر کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ کوئی انہیں سر آنکھوں پر بٹھائے۔ ناحق پسند لوگوں کے ساتھ ہمدردانہ بے نیازی کا رویہ ہی ٹھیک رہتا ہے۔

یہاں برسوں سے لوگ فسادات کی پیشین گوئیاں کر رہے ہیں۔ اصل میں لوگ کچھ ایسے فساد پسند ہو گئے ہیں کہ انہیں ایسی خبروں سے ہی دلچسپی رہ گئی ہے کہ کہاں اور کب فساد ہوتا ہے میں کہتا ہوں کہ فسادات لوگوں کی ذہنی حالتوں کا ہی عکس ہوتے ہیں۔ باہمی خوف زدگی ناخدا ترسی اور تعصبات۔

"قطع تعلق" کوئی نیا لفظ نہیں ہے جو میں نے لکھا ہو۔ اس لفظ کے ظاہر کے پیچھے نہ پڑو ورنہ حقیقت الجھ کر گم ہو جائے گی۔ یہ تم جانتی ہو اور وہ لوگ بھی جنہیں میرے خیالات معلوم ہیں کہ میں تعلقات کو کن بنیادوں پر استوار کرنا چاہتا ہوں۔ اس بات میں کوئی ایسے ایٹمی اثرات نہیں ہیں جس پر اتنی ساری چہ میگوئیاں شروع ہو جائیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اچھے اچھوں کے لیے ہیں اور برے بروں کے لیے۔ حدیث کہتی ہے کہ صالح لوگوں سے تعلقات بڑھاؤ اور برے لوگوں سے تعلقات توڑ دو۔ یہی مومن کی زندگی کا اصل الاصول ہونا چاہیے۔ اس کام کے لیے مسلمان کو ہمیشہ آنکھیں کھلی رکھنی چاہییں اور اپنی سوسائٹی ماحول اور رشتہ داروں

کے متعلق پرکھ جاری رکھنی چاہیئے کہ اس میں کس قسم کے لوگ شامل ہیں اور کس قسم کے لوگ شامل ہو رہے ہیں اور اسے ان سب لوگوں کو جو شامل ہوں یا شامل ہو رہے ہوں اسی کسوٹی پر پرکھنا چاہیئے جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے تعلقات کی استواری کے لیے مومنوں کے سامنے رکھ دی ہے۔ یعنی نیکی اور تقویٰ۔ جو نیک اور صالح ہو اس سے تعلقات بڑھاؤ جو بد اور فاسق ہے اس سے تعلقات گھٹاؤ۔ کیا کوئی بڑے سے بڑا صوفی اور معمولی سے معمولی مسلمان بھی اسلام کے اس اصول سے انکار کر سکتا ہے کہ تعلقات کی بنیاد نیکی اور تقویٰ پر ہی ہونی چاہیئے جب سب لوگ اس اصول کو مانتے ہیں تو پھر ایک شخص اگر کہتا ہے کہ وہ تعلقات کی بنیاد اسی اصول پہ رکھے گا جو بد ہیں ان سے کٹے گا اور جو اچھے ہیں ان سے جڑے گا تو آخر اس میں کون سی قیامت آ جاتی ہے کہ اس پر "قطع تعلق" کا عنوان لگا کر اس موضوع کو مجلس مذاکرہ میں پیش کر دیا جائے۔

لوگوں کی نظر میں یہ بات تو رہ گئی کہ میں نے "قطع تعلق" کی بات کی ہے لیکن تعلقات کی استواری کے لیے بنیاد کیا پیش کی ہے اسے انہوں نے نظر انداز کر دیا ہے یہ تو عجیب قسم کی سخن فہمی ہے جس کا نزول شاید ان حضرات پر عالمِ بالا سے ہوا ہے ورنہ عام عقل کا آدمی تو اس کا مفہوم خوب سمجھتا ہے۔

دہلی — ۳ جون ۴۷ء

۵۴

کل دفتر میں تمہارے دو خطوط ملے۔ ایک ۳، اور ایک ۴، جون کا۔
ادیب دوستوں کی موجودگی اور ادبی اجلاسوں کے انعقاد کا ذکر کر کے تم نے اسے میری تنہائی کا علاج تجویز کیا ہے۔ ماشاءاللہ خوب معالج ہو۔ دل کے مریض کو کان کے درد کی دوا آخر تمہارے نزدیک کیوں درست ہو گئی۔ خوشبو کی کمی اشک آور گیس سے اور تازہ پھول کی کمی کاغذی گلدستے سے پوری کرنا چاہتی ہو۔ یہ تو وقت گزارنے کی بات ہے۔ بخدا دہلی میں ان دنوں وقت کاٹے نہیں کٹ رہا ہے۔ مولانا مودودی کہتے ہیں کہ طاغوت سے تعاون حرام ہے اور اب یہ ملازمت میرے لیے بوجھ بن گئی ہے۔ استعفیٰ منظور نہیں کرتے، کہتے ہیں کہ چھٹی لے لو۔ کل نومبر دفتر میں ان لوگوں سے بہت جھگڑا ہوں امید ہے کہ جلد ہی نجات مل جائے گی۔

اب دکان کے سامان کی صرف چند چیزیں باقی رہ گئی ہیں۔ جو آج کل میں پوری ہو جائیں گی اس کے بعد یہ سارا سامانِ تجارت لاد کر پنجاب کے لیے روانہ ہو جاؤں گا اور زندگی کی گاڑی کو ایک سمت سے ہٹا کر دوسری سمت پر لے جاؤں گا۔ اضطراب پیدا ہو جانے کے بعد بھی زیادہ دن طاغوت سے تعاون رہا تو ڈر ہے کہ مداہنت اور کمزوری نہ پیدا ہو جائے جس میں سارے ملازمت پیشہ مسلمان گرفتار ہیں اور اس کے لئے ہزاروں تاویلیں کرتے رہتے ہیں۔
موجودہ کتابِ مقدس انجیل تو مختلف لوگوں کی اپنی بنائی ہوئی باتوں کا مجموعہ ہے۔

یہ انجیل وہ نہیں ہے جو خدا نے حضرت عیسیٰؑ پر نازل کی تھی نہ ہی یہ حضرت عیسیٰؑ کی حدیثوں کا مجموعہ ہے۔ یہ تو بس یونہی حضرت عیسیٰ کے بعد ان کے حواریوں یا ان کی اولادوں کے خطوط اور زبانی قصے کہانیاں اور ملی جلی باتیں ہیں۔ بس ڈھیروں ریت میں چند سونے کے ذرات ملے جلے ملتے ہیں اسے پڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں سوائے ادبی ذوق کی تسکین کے۔

چوہدری علی احمد خاں کا پھلور سے خط آگیا ہے۔ انہوں نے میرے لیے پھلور میں ریلوے روڈ پر ایک دکان کرائے پر لے لی ہے اور اس کا ایک ماہ کا پیشگی کرایہ بھی دے دیا ہے۔ یہ دکان میں دیکھ آیا تھا اچھی ہے اور مجھے پسند ہے۔ اگرچہ مین بازار سے ذرا دور ہے پھر بھی غنیمت ہے۔ چلو دکان کا مسئلہ بھی طے ہوا۔ اب میں آیا کہ آیا۔ آج اگر سامان تیار ہو گیا تو شاید کل ہی یہاں سے رخصت ہو جاؤں۔ دفتر اور جماعت کے احباب مجھے الوداعی دعوت دے رہے ہیں۔ دفتر سے میرا استعفیٰ منظوری کی سفارش کے ساتھ اوپر چلا گیا ہے البتہ میں کل سے طویل رخصت پر فارغ ہو رہا ہوں۔ اب کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں پھلور میں آباد۔

ان دنوں دہلی شہر میں تو امن ہے لیکن میرے دل میں امن نہیں ہے۔ ایک عظیم تبدیلی کے لیے اپنے آپ کو تول رہا ہوں۔ ہر شخص ملازمت سے علیحدگی کا مخالف ہے۔ لیکن میں اس بادِ مخالف میں اپنا سفینہ مخالف سمت میں ہی کھینے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔

دہلی۔ محلہ گوسیاں۔ ۶ ، جون ۴۷ء

٥٥

طاغوت سے چھٹکارے کا جو انقلاب میرے پیش نظر تھا وہ میں نے برپا کر دیا ہے۔ آج صبح کی گاڑی سے جالندھر چلا آیا ہوں۔ ملازمت سے فارغ ہو گیا ہوں بہت خوش ہوں لیکن پھر بھی میرا دل کچھ اداس سا ہے۔ شاید یہ مشرقی پنجاب کے افق پر امنڈتے ہوئے طوفان کے اثرات ہیں۔ اللہ پاک مسلمانوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

یہاں آیا تو بہت سے خطوط آئے ہوئے رکھے تھے۔ تم نے اخبار کوثر میں چراغ راہ رسالے کا اشتہار بھی دیکھا ہوگا اسلامی ادب کا یہ ایک یا جریدہ ہے۔ کچھ لکھنے کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن ان دنوں یہ حال ہے کہ فرصت کسے کہ دبدبہ کا سامان کرے کوئی۔ ان دنوں امی بیمار ہیں تو تمہیں چاہیئے کہ انہیں کبھی کبھی کوئی ہلکا پھلکا دینی مضمون ہی پڑھ کر سنا دیا کرو۔ تبلیغ دین کے معاملے میں تم اپنی حد تک سعی کرتی ہی ہو گی۔ میں تو چاہتا ہوں کہ عورتوں میں تمہاری ملنے والی کوئی ایسی خاتون نہ رہے جو تمہارے خیالات سے واقف نہ ہو جب تم نے کافی مطالعہ کر لیا ہے تو پھر اسے اپنے حلقۂ تعارف میں پہنچانے کی بھی ضرور فکر کرو۔ جن تک تمہاری رسائی ہے۔ آخر اس سلسلے میں تمہاری ذمہ داری بھی تو ہے۔ تمہیں اپنی صاف گوئی کو برقرار رکھنا چاہیئے۔ صاف گوئی اللہ پر توکل اور بھروسہ۔ سب سے زیادہ اللہ کا ڈر محبت اور سچ بات کہہ دینا۔ مسلمان کو سچ بات کہنے سے کبھی بھی نہ رکنا چاہیئے۔ چاہے اس سچائی کی زد اس کے اپنے خلاف پڑے یا اپنے عزیزوں اور بزرگوں کے خلاف۔ گھر والوں کو ملازمت چھوڑنے کے بارے میں تسلی دینا۔ انہیں کہنا کہ وہ بھروسہ صرف اللہ پر ہی رکھیں۔

بے صبری کے مقابلے میں صبر اور ناشکری کے مقابلے میں شکر اللہ کو زیادہ پسند ہے۔
اللہ پر توکل اور تمہاری یاد کے سہارے پر ہی اب دن گزریں گے۔

دکوہا جالندھر۔ ۸ جون ۱۹۴۷ء

منزل کی طرف ایک قدم

۵۶

دہلی سے پھلور پہنچ گیا ہوں۔ کئی دن صرف کر کے دکان بھی سیٹ کر لی ہے، اسطرح دکان کھول کر زندگی کے ایک نئے دور میں جو میری زندگی کا پہلا تجربہ ہے داخل ہو گیا ہوں۔ چوہدری صاحب نے دکان کی ترتیب دینے میں بہت مدد دی ہے۔ ابھی گاہک کہاں ہیں اس لیے فارغ بیٹھا ہوں اور جب فارغ ہوں تو تم سے باتیں کرنے کو تو خواہ مخواہ جی چاہتا ہے۔

اس لیے آؤ ہم تم باتیں کریں۔ کاغذ قلم کی باتیں تو بے آواز باتیں ہوتی ہیں۔ بہر حال یہی زندگی کا ایک رخ ہے جو اپنی خاص دلچسپی رکھتا ہے۔

میرے خیال میں وہ شخص بہت خوش قسمت ہے جو گزرنے والے وقت سے اپنی مسرت کا حصہ وصول کر لے اور اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ انسان راستی، سچائی اور نیکی کو زندگی میں داخل کر لے۔ یہ چیزیں زندگی میں روشنی لاتی ہیں اور یہ روشنی وہ روشنی ہوتی ہے جو دل و دماغ اور ضمیر تک کو مسرت کے لبادے اڑھا دیتی ہے۔

آج میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں کچھ نئی ہیں اور کچھ پرانی۔ کچھ بار بار کی دہرائی ہوئی ہیں اور کچھ کبھی کبھی کہی گئی ہوں گی میں ان سب باتوں کو بہت ضروری سمجھتا ہوں۔ اس لیے انہیں تکرار کے ساتھ کہتا ہوں۔ خط عموماً سنجیدگی سے پڑھا جاتا ہے اور اپنے اثرات زیادہ دیر تک رکھتا ہے اس لیے خط کو ہی ان باتوں کو تم تک پہنچانے کا ذریعہ بناتا ہوں۔

سب سے پہلی بات جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ "تمیزِ نیک و بد" ہے۔ برا نہ ماننا اور نہ ہی اس سے یہ سمجھنا کہ میں خدانخواستہ تمہاری اس صفت سے انکار کر رہا ہوں۔ حاشا وکلا ہرگز نہیں۔ لیکن اس صفت کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ پھر تجرد کی زندگی اور شادی کی زندگی میں فرق ہونے کی وجہ سے بھی اس صفت کے انداز میں فرق ہو جاتا ہے۔ جب تک انسان بچہ ہوتا ہے اس کے نیک و بد کو والدین اور دوسرے بزرگ دیکھتے ہیں وہ اپنے نیک و بد سے قطعی نابلد ہوتا ہے۔ پھر جوان ہو کر تجرد کی زندگی میں اس پر سے والدین کا دباؤ قدرے ہلکا ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنے نیک و بد کو خود دیکھتا ہے اور ساتھ ہی والدین کی مدد بھی اسے حاصل رہتی ہے لیکن والدین کی حقیقی کوشش یہی ہوتی ہے کہ اسے اپنے نیک و بد کا خود احساس پیدا ہو جائے تاکہ آئندہ زندگی کے سفر میں وہ خود فیصلے کرنے کے قابل ہو جائے۔ پھر شادی سے نمایاں تغیر ہوتا ہے لڑکا اچانک بڑی ذمہ داری کا سامنا کرتا ہے اور اسے اپنے نیک و بد کو قطعاً خود ہی دیکھنا ہوتا ہے۔ دوسروں کی امداد صرف مشورے کی حد تک رہ جاتی ہے اور وہ مشورے بھی کسی کے اندرونی حالات کو مناسب حد تک نہ جاننے کی وجہ سے مؤثر نہیں ہوتے اس لیے وہ خود ہی سب کچھ سوچتا اور اقدام کرتا ہے اور ساتھ ہی اسے ایک دوسری ہستی کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے۔ اس کے نفع و نقصان پر اس کے ہر طرزِ عمل کا اثر پڑتا ہے البتہ لڑکی کی زندگی میں شادی کے بعد بھی کچھ بہت زیادہ نمایاں تغیر نہیں ہوتا۔ بعض اوقات قطعی نہیں ہوتا اور بعض اوقات معمولی سا ہوتا ہے۔ پہلے اگر اس کے نیک و بد کا احساس اس کے والدین رکھتے تھے تو اب اس کا شوہر رکھنے لگتا ہے۔ اس بنا پر اس کی زندگی میں کچھ زیادہ تغیر نہیں ہوتا۔ البتہ اگر لڑکی نہایت باشعور اور غمخوار ہو تو اسے اپنے ساتھی کا ذہنی اور قلبی بوجھ ہلکا کرنے کا

خیال ضرور رہنے لگتا ہے جو والدین کے گھر میں نہیں ہوتا۔
وہ لڑکیاں جو نیک و بد کے احساس کی پونجی والدین کے گھر سے لاکر شوہر کے پاس جمع کرا دیتی ہیں اور وہ بھی جو اس احساس کا بوجھ خود تھوڑا سا اٹھانے کی کوشش کرتی ہیں عموماً دونوں ہی زندگی میں کامیاب رہتی ہیں۔ کسی کو ویسے ہی بدقسمتی سے نالائق اور خبیث طینت شوہر سے واسطہ پڑ جائے تو الگ بات ہے۔ پہلی قسم کی لڑکیوں کو دنیا نہایت اطاعت گزار فرمانبردار اور بالعموم "شوہر پرست" کہتی ہے۔ میرے نزدیک یہ دونوں قسم کی لڑکیاں کامیاب بیویاں بن سکتی ہیں۔ اس ساری گفتگو میں میں نے صرف ان دو قسموں کا ذکر کیا ہے جو کامیاب بیویاں ہوتی ہیں اور وہ جو ناکام ہوتی ہیں یہاں مجھے ان سے بحث نہیں ہے۔
اب میں اس اجمال کی تفصیل بیان کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی قسم کی عورت اپنے شوہر کی گہری ہمدرد پوری فرمانبردار مکمل مطیع اور بہترین محبت نواز ہوتی ہے۔ نیز وہ اپنے شوہر کی اندھی مقلد ہوتی ہے۔ اندھی مقلد سے میری مراد یہ ہے کہ وہ اسی طرف مڑ جاتی ہے جس طرف اس کا شوہر مڑتا ہے۔ شوہر اگر دائیں کو مڑتا ہے تو وہ بھی دائیں کو مڑ جاتی ہے شوہر اگر بائیں کو مڑتا ہے تو وہ بھی بائیں کو مڑ جاتی ہے۔ وہ اچھائی کرتا ہے تو یہ بھی اچھائی کرتی ہے۔ اور افسوس کہ اگر وہ کوئی غلطی یا برائی کرتا ہے تو یہ بھی اس غلطی سے نہیں بچ سکتی بلکہ اس میں بہتی چلی جاتی ہے۔ اس بیوی کے لیے شوہر کو بے انتہا محتاط رہنا پڑتا ہے۔ کڑی نظر زندگی کی غلطیوں پر رکھنی ہوتی ہے خصوصاً اپنی غلطیوں پر تاکہ اس کی غلطی کے ساتھ اس کا ساتھی بھی غلط راستہ اختیار نہ کرلے۔ اس کے فرائض کو ادا کرنے میں خود اپنے طور پر ہی بے انتہا محتاط اور ہوشمند رہنا پڑتا ہے اور ان فرائض کو ادا

کرنے میں اسے نگرانی احتیاط اور رہنمائی کے سارے کام بھی خود ہی ادا کرنے ہوتے ہیں۔ اس کی زندگی کی گاڑی کا دوسرا پہیہ بس اس کے ساتھ ساتھ اس کے رخ پر بچے کی طرح چلتا رہتا ہے۔

البتہ دوسری قسم کی عورت اپنے شوہر کی گہری ہمدرد، پوری فرمانبردار، مکمل مطیع اور محبت نواز ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی مخلص اور اس کی ساتھی اور رفیق بھی ہوتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ زندگی کے سفر میں اپنے کان آنکھ ناک اور زبان ہاتھ پاؤں اور دل و دماغ سب کو استعمال کرتی ہے۔ وہ شوہر کی فرمانبردار ہوتی ہے۔ لیکن جب تک وہ راستی پر چلتا ہے جونہی وہ راستی سے ہٹتا ہے بیوی کی زبان اسے راستی کی طرف اشارہ کرنے کے لیے مستعد رہتی ہے۔ شوہر کے ساتھ وہ اپنی آنکھ کان ناک ہاتھ پاؤں دل و دماغ سب سے کام لیتی ہے اور ان کو زندگی کا راستہ دیکھنے، حالات کو سونگھنے، واقعات کو سننے، فاصلوں کو طے کرنے، اور مسائل کو سوچنے اور غور کرنے میں استعمال کرتی ہے وہ دیکھتی ہے کہ فلاں حرکت یا بات ہم دونوں کی عزت کے لیے مفید ہے یا نہیں۔ یہ وہ صرف شوہر سے ہی نہیں پوچھتی بلکہ اپنے دل و دماغ آنکھ کان سے کام لے کر بھی اس کا فیصلہ کرتی ہے۔ وہ ان کاموں سے خود بخود رک جاتی ہے جن میں اس کی یا اس کے شوہر کی ہتک، سبکی یا نقصان ہو یا اللہ اور اس کے رسولؐ کی نگاہ میں وہ غلط ہو۔ ایسے کام وہ خود بخود کر لیتی ہے جن میں اسے خدا اور اس کے رسولؐ کا حکم صریح مل جائے، جو سچائی، نیکی راست بازی اور پاکیزگی کے ہوں یا جن میں اس کے شوہر کی عزت نفع یا وقار ہو اور یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ ایسے کون کون سے کام ہیں اسے فوراً دماغ دل اور آنکھ کان کے استعمال کی ضرورت پڑتی ہے اور جب وہ ایسا کر لیتی ہے تو گویا وہ شوہر کے

ایک بڑے بوجھ کو ہلکا کر دیتی ہے۔ وہ جو کچھ کرتی ہے اس کے شوہر کو اس پر اعتماد ہوتا ہے اور ساتھ ہی بیوی کا ضمیر بھی اس کے سامنے سرخرو ہوتا ہے۔ ایسے فیصلے کرنے کے لیے حالات کا مطالعہ آنکھوں سے کر کے، واقعات کو کانوں سے سن کر، ماحول کو دل سے جانچ کر، اور دماغ سے سوچ کر وہ فیصلہ کر سکتی ہے اور اس کا فیصلہ شوہر کے حق میں عموماً درست ہوتا ہے۔ البتہ اگر کبھی غلطی کا امکان پیدا ہو جاتا ہے تو اس کا شوہر اس میں اسے مدد دیتا ہے اور وہ خود بھی پوچھ لیتی ہے، اب میں تمہیں یہ بات ایک مثال سے سمجھاتا ہوں.

مثلاً تمہیں ایک کام کرنا ہے۔ ایک سہیلی سے ملاقات کرنا ہے۔ اس میں دو راہیں ہیں پہلی راہ تو پہلی قسم کی عورت کی ہے کہ وہ چپکے سے پوچھ لے مل آؤں یا نہ ملوں۔ اب اس کا شوہر، جو حالات اور پس منظر ان دونوں سہیلیوں کے حقیقی تعلقات کی گہرائی اور نوعیت اور سہیلیوں کے گھر حالات اور اس کی خصلت سے بالعموم ناواقف ہے کوئی مؤثر فیصلہ نہیں دے سکتا۔ ممکن ہے کہ وہ غلط فیصلہ کر دے۔ جس سے خواہ مخواہ اس کی بیوی کی دلآزاری ہو یا نقصان ہو یا برا اثر پڑے یا ماحول غلط ہو۔ غرض شوہر کے فیصلے میں غلطی کا بہت امکان ہے جس حالت میں وہ صورت حال سے ناواقف ہے اور بیوی اسے اس کشمکش میں ڈال کر اس کی رواداری کا امتحان لیتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ اسے اجازت نہ دے کر غلطی کرے جب کہ خواہ مخواہ ایک عزیز بیوی کی دلآزاری ہو حالانکہ اس ملاقات میں کوئی قباحت نہ ہو۔ بہت ممکن ہے کہ اجازت دے کر وہ غلطی کرے اس لیے کہ اس سہیلی کے اخلاق یا اس کے گھر والوں کے اخلاق یا کردار یا ان کے رہنے سہنے کے طور طریقے یا خیالات یا سلوک ایسا ہو کہ جس سے اس کی بیوی کو ذہنی یا قلبی سکون کی بجائے کوفت ہو۔ اچھی سوسائٹی کی بجائے مجہول لوگوں سے واسطہ پڑے۔ سنجیدہ اور دینی باتوں کی بجائے غیر سنجیدہ اور نامعقول

باتیں میسر آئیں۔ غرض اس فیصلے میں غلطی کے بہت سے امکانات ہیں۔

لیکن اگر اسی بات کا فیصلہ بیوی خود کرے تو وہ صحیح حالات کو جاننے کی وجہ سے شوہر کی طبیعت کے رجحانات جاننے اور اللہ اور اس کے رسول ؐ کے احکامات سے آگاہ ہونے کی وجہ سے صحیح فیصلہ کر سکے گی۔ مثلاً وہ پہلے سہیلی کے ماحول، گھر کا فاصلہ، ان کے گھریلو حالات۔ اس گھرانے کی اخلاقی حالت وغیرہ پر غور کرے۔ ان کی بود و باش رجحانات اور طرز فکر پر غور کرے۔ جب وہ اس لحاظ سے اس لڑکی سے ملنا موزوں سمجھے تو پھر وہ یہ غور کرے کہ اسے کس مقصد کے تحت ملنا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ وہ مقصد کا تعین کرے۔ اپنے نظریات و خیالات کے مطابق اسے ترغیب و تبلیغ کی نیت کرے۔ پھر وقت کی موزونیت دیکھے۔ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مفید مطلب باتیں کرنے کی کوشش کرے۔ پھر ایسے وقت کا تعین کرے جب اس کے گھرانے کے دوسرے مرد کام کاج پر ہوں تاکہ وہ اس کی وجہ سے خواہ مخواہ بے آرام نہ ہوں یا تکلیف اور بدمزگی کی وجہ سے ملاقات بے فائدہ نہ ہو جائے۔ ان سب باتوں کو سوچنے کے بعد وہ اپنے ساتھ کسی چھوٹی بہن یا قریبی رشتہ دار عورت کو ساتھ لے کر اسے جا کر مل آئے۔ اس قسم کی عورت واقعی لائق ستائش ہو گی جو زندگی کے اپنے پہیے کو راستی کے ساتھ چلانے کے لیے دوسرے پہیے کا اس طرح ساتھ دے جیسے اسی کے اشارے پر چل رہی ہے اور شوہر بھی یہ سمجھے کہ واقعی اس نے اس کی رائے اور ذوق کے مطابق کام کیا ہے۔ اس طرح اسے کبھی دوسرے ساتھی کے اعتراض کا موقع سامنے نہ آئے گا۔

اسی احساس کو میں "تمیز نیک و بد" کا نام دیتا ہوں۔ یعنی اپنی ذہنی حسی اور اخلاقی قوت سے کام لے کر صحیح راستے کو شوہر اور خدا و رسول ؐ کی مرضی کے مطابق پہچان لینا اور جہاں شوہر حق سے دور ہو تو اسے بھی کھینچ کر واپس سیدھی راہ پر لانا یہ مثالی اطاعت

ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اس کے ساتھ بندھی بندھائی خود بھی دوزخ کے گڑھے میں جا گرے بلکہ اپنی تمیزِ نیک و بد اور قوتِ ارادی کے زور سے اپنے ساتھی کو بھی کھینچ کھانچ کر جنت کی طرف لے جائے۔

کامیاب عورتوں کے بارے میں میرے ذہن میں یہی نقشہ ہے۔ تم اس تصوراتی مثالی نقشے سے فائدہ اٹھا سکتی ہو۔ اگر تم دوسری قسم کی کامیاب عورتوں کی صف میں کھڑی ہو تو سمجھ لو کہ پھر زندگی کی گاڑی سچائی اور نیکی کے راستے پر فراٹے بھرتی ہوئی جائے گی انشاءاللہ۔ تم نے تبلیغ کرنے اور حق بات دوسروں تک پہنچانے میں اپنی دشواری کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ بھئی تم پریشان کیوں ہوتی ہو، ایک مبلغ کا کام تو بس یہ ہے کہ وہ دوسروں تک اپنی بات حسن و خوبی سے پہنچا دے۔ حق کے ساتھ لوگ کس طرح پیش آتے ہیں وہ حق کو رد کرتے ہیں یا قبول کرتے ہیں یا اس پہ ناک بھوں چڑھاتے ہیں یہ مبلغ کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔ اس لیے اسے اس کی پروا نہ کرنا چاہیئے۔ اس کے اثرات حق پہنچانے والے پر نہیں پڑتے۔ حق پہنچانے والے کا کام تو وہیں ختم ہو جاتا ہے جہاں اس نے ایک سچی بات دوسروں تک پہنچا دی۔ میری رائے ہے کہ تم شہادتِ حق اور خطبات کو دوبارہ پڑھ لو۔ اس سے تمھیں بہت فائدہ ہوگا۔

جانم۔ ایک کام اور کرو۔ تم ترجمان القرآن میں سے روزانہ صبح کے وقت تفسیر کے ساتھ قرآن پاک پڑھا کرو اور ہو سکے تو چند احادیث بھی۔ انشاءاللہ تمہارے علم میں اضافہ اور قلب میں سکون پیدا ہوگا۔ ترجمان کے تازہ پرچے میں مولانا مودودی کی عورتوں کے ایک جلسے میں تقریر شائع ہوئی ہے جو بے نظیر ہے، بس اسے مسلمان عورت کے کردار کا آئینہ سمجھ لو اور اس کردار کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرو۔

مومن عورت میں ایمان کی وہ قوت ہونی چاہیئے کہ نہ وہ کسی سے ڈرے سوائے اللہ و رسولؐ اور ان کے حکم کے ماتحت شوہر اور والدین سے" نہ سچ کہنے میں جھجکے اور ساتھ ہی زندگی کی مشکلات کا سامنا کرنے کیلئے بھی ہر وقت مستعد رہے۔ عام حالات میں ایک مومن عورت جتنی خاموش، گھر میں رہنے والی، سنجیدہ اور شرمیلی ہو مصیبت کے وقت اسی قدر دلیر، بارعب باہمت اور باوقار ہو۔ غیر مرد سے اگر مصیبت کے وقت گفتگو کا موقع آ ہی پڑے تو بے جھجک کرخت آواز سے بات کر سکے اللہ کے رسولؐ کی ازدواجِ مطہرات اور ان کی وساطت سے امت کی تمام عورتوں کو یہی حکم دیا گیا ہے کہ جب کسی نامحرم مرد سے بات کرو تو آواز کی کرختگی سے کرو۔ غرض یہ سب باتیں سب لڑکیوں کے جاننے کی ہیں۔

ابھی ابھی زلزلے کے دو تین جھٹکے محسوس ہوئے ہیں۔ ملک کا مستقبل ڈانوا ڈول ہے۔ یہ زلزلہ کیا ہے بس تقسیم ملک کے جھٹکے ہیں۔ بس سمجھ لو کہ ملک اب تقسیم کے کنارے پر کھڑا ہے۔

آج تمہارے ساتھ قلمی مجلس میں بہت سی باتیں کر ڈالیں۔ بعض اوقات میں بڑی پر لطف باتیں کیا کرتا ہوں اس سے تم ناواقف نہیں ہو۔ اور بعض اوقات میں جلی کٹی اور نوکیلی باتیں بھی کیا کرتا ہوں اور اسے بھی تم جانتی ہو۔ مجھے خود ان دونوں کیفیتوں کا احساس ہے۔ تم مجھے اچھی طرح جانتی ہو۔ اگر نہیں جانتی ہو تو یہ تمہاری کوتاہی ہے۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ بہر حال اگر میری بعض باتیں تمہیں نوکیلی معلوم ہوں تو سوچو کہ میں شیریں باتیں بھی تو کیا کرتا ہوں۔ اگرچہ میرا خیال ہے کہ تم سمجھدار ہو اور ان باتوں پر غور کرو گی تو انہیں مفید پاؤ گی۔

آخر جب کوئی شخص کسی درخت کے نیچے اپنا مستقل ڈیرہ ڈالتا ہے تو اس کو اس درخت کے سارے موسموں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ بہار کے پھول بھی اس کے دامن کو بھرتے ہیں تو اس کی خزاں کے پتے بھی اس کی گود میں گرتے ہیں۔ شیریں پھل بھی اسی کے لیے ہیں اور کانٹے بھی اسی کے حصے میں آتے ہیں۔ بہر حال ایک مستقل رفاقت میں ہنسنا بھی ہوتا ہے روٹھنا بھی ہوتا ہے۔ ماننا بھی ہوتا ہے ضد کرنا بھی ہوتا ہے اور انس و محبت کی باتیں بھی ہوتی ہیں۔ تلخی تندی شیرینی یہ سب زندگی کے مختلف رنگ ہیں۔ اور ان کے بغیر تو زندگی کی یک رنگی زندگی کو بالکل ہی بے رنگ اور بے لطف کر دے گی۔ بعض لوگ تلخ باتیں کرنے میں اتنے ماہر ہوتے ہیں کہ ایک بات کان میں پڑ جائے تو چالیس بار کان دھلانا پڑے تب بھی تلخیٔ سماعت دور نہ ہو۔ لیکن تم جانتی ہو کہ میں ان میں سے نہیں ہوں۔

پھلور۔ ۲۰ جولائی ۱۹۴۷ء

۵۷

چار دن سے تمہارا خط پہنچ چکا ہے۔ جان بوجھ کر جواب ٹالتا رہا ہوں۔ چار دن پہلے جواب دیتا تو وہ کچھ اور ہوتا۔ چار دن بعد جواب دے رہا ہوں تو یہ کچھ اور ہے اور میں خوش ہوں کہ یہ چار دن پہلے کا خط نہیں بلکہ بعد کا خط ہے۔ ان چار دنوں نے مجھے جذبات کی تلخی اور تندی میں سے نکال کر صبر و شکر اور

درگزر کے راستے پر ڈال دیا ہے ۔ شکوؤں کا جواب جب جوابی شکوے ہوں اور شکایات کا جواب جب جوابی شکایات کی صورت میں سامنے آئے تو دل کی کسک بڑھ جاتی ہے ۔ اپنوں کے سامنے تو شکوہ اس لیے زبان پر آیا کرتا ہے کہ اس کے جواب میں ہمدردی کا پھاہا میسر آئے اور شکایت کا اس لیے اظہار ہوتا ہے کہ اس کے جواب میں شیریں کلمات کی ٹھنڈک ملے ۔ اپنوں کے سامنے تو آنسو اس لیے نکلتے ہیں کہ کوئی دامن اٹھا کر پونچھ دے اور تسکین کا باعث بنے ۔ یہ تو کسی کی بڑی سنگدلی ہوگی کہ وہ کسی کی کراہ کے جواب میں آگے سے کراہ دے اور کسی کی شیرینی کے جواب میں جوابی شیرینی دے دے ۔ سختی کا جواب سخت اور نرمی کا جواب نرم دینا تو ساری دنیا کا بے عایت اصول سہی لیکن ہمیں باہمی ترکی بہ ترکی جواب کا فارمولا تو نہیں اپنانا چاہیئے ۔ یہ طرزِ عمل شاید دنیا کے عام لوگوں کے ساتھ نبھ جائے لیکن ان دو ہستیوں کے درمیان مناسب نہیں ہے جنہوں نے اپنی زندگیاں ایک دوسرے سے وابستہ کر دی ہوں ۔ تم دنیا کے ہر شخص کی بات کا ترت جواب فوری اور مناسب اور حق کے مطابق بے نیازانہ دے سکتی ہو اور میرے لیے بھی یہی معیارِ حق رکھو لیکن میری بات کا جواب دینے سے پہلے کچھ مزید سوچنے کی ، میرے شکوے یا شکایت کی تہہ میں میرے زخمی احساس کا اندازہ لگانے کی اور میری ذہنی کیفیت کو جاننے کی بھی کچھ ضرورت ہے ۔ تمہارا برتاؤ میرے ساتھ خصوصی ہوگا اگرچہ گنہگاروں کو لوگ پتھر ہی مارا کرتے ہیں ۔ لیکن شبلی کو تو پھول مارنے کی بھی اجازت نہیں ہے ورنہ صبر سے پتھر کھانے والا ضرور شبلی کے پھول سے بھی رو پڑے گا ۔ یہی وہ قلبی وابستگی ہے جس میں جواب کی فکر سے زیادہ پیرایۂ جواب کی فکر ضروری ہوتی ہے ۔

اپنوں کو جواب دیتے ہوئے ان کے سارے احساسات اور جذبات کا بھی پاس رکھنا ہوتا ہے ہو سکتا ہے کہ کسی نے ایک بات تمہاری طرف سے صرف صرف تسلی سننے کے لیے ہی کہی ہو۔

بہر حال مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہے اور نہ ہی مجھے اپنی قسمت پر تمہاری طرح گلہ ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھا ہے اور اب بھی سمجھتا ہوں جب ایک شخص حق پر ہو تو اس سے بڑا خوش قسمت کون ہو گا۔ لوگوں نے قسمت کو مال و دولت، عزت و جاہ محل و چبوترہ اور نسل و خاندان سے باندھ رکھا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ جب تک مجھے اپنے خدا پر توکل ہے اور اپنے رفیقِ زندگی پر اعتماد و اطمینان ہے نہ میں بد قسمت ہوں نہ میں غم نصیب ہوں اور نہ عمر بھر روتے رہنے کا تمنائی ہوں۔ بس حق گوئی اور گستاخی کے نفسیاتی فرق کو ملحوظ رکھنا چاہتا ہوں۔

دو تین دن سے دل بہت بے چین ہو رہا ہے۔ مشرقی پنجاب کے فسادات سے یہ پھلور بھی لہو لہان ہو رہا ہے۔ نہ معلوم اس ملک کی قسمت میں کیا لکھا ہے کتنی تباہی ابھی باقی ہے۔ اکا دکا لاشیں روزانہ تھانے میں آتی ہیں۔ انسان انسان کو مار رہا ہے۔

طاغوت کی چاکری سے نجات پا کر دوکان تو کھول لی ہے۔ اور میں اس وقت یہ خط دوکان سے ہی لکھ رہا ہوں۔ اس طرح سرِ بازار بیٹھ کر یوں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے یہ دکان کھول کر دنیا کے سارے غالب نظاموں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر رکھا ہے۔

پھلور ۲۲، جولائی ۴۷ء

۵۸

تمہارے نام خط لیٹر بکس میں ڈال کر آیا تھا کہ تمہارا خط ملا - پھلور میں مکان حاصل کرنے کے لیے کوشش کر رہا ہوں اور وہ بھی دکان کے قریب - مشکل یہ ہے کہ فسادات کا زور بڑھ رہا ہے اور مسلمانوں کے محلوں میں رہائشی مکانات کے اندر لوگوں کے دیہاتوں سے آئے ہوئے رشتہ داروں کا بہت زیادہ ہجوم ہے۔

بس فکر نہ کرو جلد مکان مل جائے گا - مکان کی ایسی ہی دشواری دہلی میں بھی پیش آئی تھی لیکن میں تمہیں موجودہ مکان میں لانا نہیں چاہتا - موجودہ مکان کی تنگی سے تو میں خود تنگ ہوں ان دنوں مکان کے معاملے میں پھلور دہلی سے بھی بڑھا ہوا نظر آتا ہے جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہاں حلقۂ تعارف محدود ہے اور جو واقف ہیں وہ مجبوری کی بلا میں پھنسے ہیں - کوشش جاری ہے باقی اللہ مالک ہے - دعا کرو اور کئے جاؤ۔

غلطی کا جلد احساس اور اس پر کھلے دل سے معافی یہ ایمان کی نشانی ہے میں واقعی بہت خوش ہوا ہوں۔

پھلور میں آج یہاں جالندھر پھلور پھگواڑہ اور لدھیانہ کی جماعتوں کا اجتماع ہو رہا ہے - چوہدری علی احمد خاں سابق پولیس انسپکٹر اور حال اسلامی ہوٹل والے اس اجتماع کے منتظم ہیں - بھائی جان بھی جالندھر سے ۹ بجے والی گاڑی سے آ رہے ہیں - پھر اجتماع میں شامل ہونے کے لیے دکان بند کر دوں گا - ان دنوں میں یہ خوبی ہے کہ مطالعہ اور لکھنے کا وقت بہت نکلتا ہے۔

اجتماع میں تقریریں بھی ہوں گی اور لطف یہ کہ میری بھی تقریر کا پروگرام رکھا گیا ہے۔ دہلی میں سیکرٹریٹ کے بابوؤں کے سامنے خطبات میں سے کوئی خطبہ پڑھنے سے پہلے یا بعد میں چھوٹی سی تقریر کرنا اور چیز تھی اور یہ تقریر اور ہے۔ اس طور پر یہ میرا پہلا تجربہ ہے۔ کھلی ہوئی چیز ہے کہ کامیاب پسپائی ہوگی۔ میں تقریر کے میدان کا آدمی نہیں ہوں لیکن چوہدری صاحب کا شدید تقاضا ہے کہ لازماً تقریر کروں۔ بہرحال اللہ مالک ہے یہ کوئی تقریری مقابلہ تو ہے نہیں۔ اللہ کی راہ میں خدمتِ دین کے لیے جدوجہد اور سعی کے مختلف طریقے ہیں اور ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اپنی سعی کوشش کرے۔ تم دعا کیا کرو کہ خدا مجھے اپنی راہ میں زندہ رکھے اور اپنی راہ میں ہی اٹھائے۔ بخدا موت ہو تو شہادت کی ہو مسلمان کے لیے تو چارپائی پر سسک سسک کر مرنا عجب بے لطف موت ہے۔ حضرت خالدؓ بن ولید وفات کے وقت بڑی حسرت سے شہادت کی موت کے تمنائی تھے۔ بہرحال اس تحریک اسلامی کے ساتھ میرا یقین ہے کہ یہ موقع بھی کبھی نہ کبھی ضرور آئے گا۔ یہاں کے سب لوگ بخیر و عافیت ہیں۔

آج کل کی عورتوں کی کیا باتیں کرتی ہو۔ بس ہر طرف سے یہی آوازیں آتی ہیں۔ میرا جہیز میرا سامان۔ میری مشین میرے برتن میرے کپڑے میرے زیور، ان کی دلچسپیوں کا محور یہی کچھ ہے۔ روپیہ کپڑا برتن اور سامان ہی ان کا ملجا و ماویٰ ہے۔ یہی کچھ ان کا دین و ایمان اور زمین و آسمان بن کر رہ گیا ہے۔ نہ نماز نہ نماز کی بات۔ جمود بڑا گہرا جمود اور دل کی سطح بھی بہت سخت ہے۔ بڑی دیر اور بڑی مشکل سے راستہ بنے گا۔ کوشش بھی کرو اور دعا بھی کرو۔

پھلور۔ ۲۵ جولائی ۴۷ء

۵۶

گلے شکوے کی بات چھوڑو۔ گلہ کیا اور شکوہ کس بات کا۔ کچھ نہیں یہ تو یوں ہی پرچھائیاں سی ہوتی ہیں جو گزرتی چلی جاتی ہیں۔ ایک روشن اور تابناک سورج کے سامنے ننھی سی بدلی کی کیا حقیقت ہے۔ ایک خفیف سا غبار اور مطلع صاف ہو جاتا ہے اور جب غبار صاف ہو جاتا ہے تو صبح الفت پہلے سے زیادہ روشن زیادہ واضح زیادہ تابناک اور زیادہ چمکدار ہو کر نکل آتی ہے۔ شکوے گلے اور شکائتیں زندگی کی نشانیاں ہیں یہ اپنائیت کا نکھار ہیں۔ یہ زندگی کے گہرے رشتوں کو مضبوط کرتے ہیں جیسے پینی پالش پیلے برتن کو میلا کر دیتی ہے لیکن پھر اپنی رگڑ سے ہی اسے چمکا بھی جاتی ہے۔ جیسے انار کا چھلکا اور ریت سونے کے زیور کو میلا سا کر دیتے ہیں لیکن اپنی ترشی اور رگڑ سے اسے تابناک بھی بنا جاتے ہیں۔ جیسے بارش کے بعد سورج زیادہ روشن معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اندھیرے میں سے نکل کر روشنی تیز تر محسوس ہوتی ہے یا جیسے کڑوے کے بعد میٹھا زیادہ شیریں محسوس ہوتا ہے۔ غرض یہ گلے شکوے تو محبت بھرے دل کی پالش ہے۔ سارے میل کچیل دھل کر کھری کندن کی طرح اپنائیت چمک کر ابھر آتی ہے۔

تم نے تازہ ترجمان کا پرچہ پڑھ لیا ہے مسرت ہوئی۔ مطالعے کے دن اب روزوں کی صورت میں آرہے ہیں۔ مکان کے حصول کے لیے اپنی ہر امکانی جدوجہد کر رہا ہوں۔ رمضان میں تمہارا یہاں ہونا بہت ضروری ہے۔ خوب! تم نے پھر دہلی

ہسپتال میں اپنے پریشان کن نامکمل برخوردار کی یاد کو تازہ کر دیا اور حسرت سے بہت سی باتیں لکھ ڈالیں ۔ چہ خوب ۔

تمہارے ان تاثرات کی مثال تو یہ ہے کہ جیسے میں کہوں کہ وہ جو میں نے آم کی گٹھلی پھینکی تھی اگر صحن میں اُگ آتی اور اس کو پھل لگتے تو ہم خوب خوب آم کھاتے اور پھر افسوس کرنے بیٹھ جاؤں کہ اس گٹھلی کو بھنگن کیوں جھاڑو دیتے ہوئے صاف کر کے لے گئی ۔ اے کاش وہ گٹھلی اگتی ۔ اے کاش وہ آم کا درخت بنتی ۔ اے کاش اسے پھل لگتے ۔ اے کاش میں اس کے کچے آموں کا مربہ اور اچار ڈالتا ۔ کچے آموں میں سے کچھ پال ڈالتا ۔ پھر ٹپکے کے آم چوستا ۔ پھر دودھ پی کر خوب موٹا ہو جاتا ۔ اگر آندھی سے وہ درخت گر جاتا تو اس کا ایندھن بنتا ۔ بیٹھک کا شہتیر بنتا وغیرہ وغیرہ اس طرح میں "اے کاش" کا ایک بڑا سا ڈھیر لگا کر اس میں اپنے لیے ایک کھوہ بنا لوں اور اس میں گھسا بیٹھا رہوں ۔ ماشاء اللہ چشم بددور ۔ ہماری عزیز بیگم کو اپنے تلف شدہ برخوردار کی یاد بہت ستا رہی ہے اور دل پر مونگ ہنیں بلکہ مُتڑ دل رہی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ روڑی کوٹ رہی ہے ۔ مجھے بھی تمہاری ہمدردی میں اس نرس پر سخت غصہ آرہا ہے ۔ اس نالائق کی آنکھیں پھوٹیں ہاتھ ٹوٹیں ۔ ہماری بیگم پر اس نے کس قدر ظلم کیا ۔ دل چاہتا ہے کہ یہیں سے ایک ہوائی چپت اس کے سر پر جماؤں لیکن صرف اس لیے بخشتا ہوں کہ اب دہلی بہت دور ہے بہر حال تم سے بھی یہی درخواست ہے کہ اب تم بھی اس قصے کو بھول جاؤ غصہ تھوک دو اور نرس کو معاف کر دو ۔ اس نے یہ کارگزاری اور بھی بہت سی خواتین کے ساتھ کی ہو گی جو بن کھلے غنچوں کی مائیں ہوں گی ۔

مقصدِ زندگی کی بات کرتی ہو۔ مقصدِ زندگی باطل کے بہتے ہوئے دریا کے مخالف سمت پر بہنا ہے۔ یہ راہ جو ہم نے اختیار کی ہے یہ ایسے ہے جیسے کوئی دریا کی مخالف سمت میں بہنے کی کوشش کرے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ راہ کانٹوں سے پُر ہے اور جنت بھی اللہ نے فرمایا ہے کہ کانٹوں سے ہی گھری ہوئی ہے۔ لیکن جب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم صحیح راہ پر ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ اللہ کی رضامندی اسی طرح ہے تو پھر کوئی بدبخت ہی ہوگا جو اپنی رضا کو اللہ کی رضا پر ترجیح دے اور دوسری راہیں اس لیے اختیار کرلے کہ وہ سہولت کی راہیں ہیں۔ یہ دنیا آزمائش گاہ ہے۔ آزمائش گاہ میں سہولت ڈھونڈنے والا ویسے ہی کامیاب ہوگا جیسے کوئی طالب علم امتحان کے کمرے میں جاکر صوفے پر لیٹ رہے۔ آئس کریم کھائے سوڈا پیئے۔ سگریٹ پیئے اور بیٹھ کر ممتحن کا شکریہ ادا کرتا رہے اور تین گھنٹے گزارنے کے بعد کمرے سے باہر نکال دیا جائے۔ اس کا نتیجہ جیسا کچھ ہوگا ویسا ہی ان لوگوں کا ہوگا جو اس دنیا میں صرف چین کی بنسری بجانے اور آرام ڈھونڈتے ہیں اور اللہ کی راہ میں کوئی مشقت بھی برداشت نہیں کرتے۔ ہمیں خدا ایسے گروہ میں شامل ہونے سے بچائے اور دین کے لیے زندگیاں لگانے کی توفیق دے۔ نظامِ باطل کی اعلیٰ ملازمت چھوڑ کر اس چھوٹی سی دوکان پر اسی لیے آکر بیٹھا ہوں۔ یہی راستہ جاتا ہے سیدھا منزل کی طرف!

پھلورہ ۲۷، جولائی ۱۹۷۶ء

۶۰

تمہیں لانے کے لیے یہاں موزوں مکان ملنا دشوار ہو رہا ہے۔ جب ایک شخص کے پاس کپڑے ہوں اور وہ انہیں پہن نہ سکے۔ کھانا ہو اور وہ اسے کھا نہ سکے۔ پھول ہوں اور وہ انہیں سونگھ نہ سکے آب شیریں ہو اور وہ پی نہ سکے۔ عزیز ہوں اور وہ پھر بھی تنہائی کا شکار ہو۔ پورے شہر کی آبادی میں اکیلا ہو۔ پر رونق بازار میں تنہا ہو۔ گھر کی چار دیواری میں بھی ڈانواڈول ہو تو اس کی وہی کیفیت ہوگی جو ان دنوں میری ہے۔

شادی سے پہلے ایک نوجوان ایسے ہی ہوتا ہے جیسے ایک درخت جو صحرا میں کہیں تنہا کھڑا ہو جسے نہ کسی کی پرواہ ہوتی ہے اور نہ کسی سے ہمدردی ہوتی ہے۔ وہ سر اٹھائے کھڑا رہتا ہے۔ لیکن شادی کے بعد اس میں ذمہ داری کا رنگ آتا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک تنہا درخت نہیں ہے جو لاپرواہی سے جنگل میں کھڑا ہو بلکہ ایک بیل بھی اس کے ساتھ لپٹی ہوئی ہے جس کی نازک شاخیں اور پتیاں اس کے جسم کے ریشے ریشے میں پیوست ہیں۔ اس کی انگلیاں اس کے وجود میں دھنسی ہوئی ہیں۔ اس کی کونپلیں اس کی زندگی کا رس لیتی بھی ہیں اور دیتی بھی ہیں۔ وہ بیل بالآخر اس درخت کی زینت بن جاتی ہے اس کے وجود کا حصہ قرار پاتی ہے۔ اس کی ہستی کا ایک جزو ہوتی ہے وہ درخت بھی اس بیل کے لیے زندگی کا ستون ہوتا ہے۔ غرض بیل اور درخت دونوں مل کر تنہا درخت سے بھی مختلف ہوتے ہیں اور تنہا بیل سے بھی مختلف ہوتے ہیں۔

یہ حالت پہلی حالت سے مختلف ہے۔

مجھے تو اپنے خدا سے اپنے پروردگار سے جو رحمٰن ورحیم وکریم ومغفور ہے نہ کوئی گلہ ہے نہ کوئی شکوہ ہے بلکہ اس کے مجھ پر اتنے کرم ہیں کہ میں اس کا شکر ادا کر ہی نہیں سکتا۔ وہ تو میرے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کو بھی درجۂ قبولیت بخشتا ہے اب تو میری اپنے اللہ سے یہی دعا ہے کہ وہ ہمیں ایک سچے مسلمان کی سی زندگی گزارنے کی توفیق بخشے۔ اپنی راہ میں ہر قربانی کی توفیق دے۔ آزمائشوں میں پورا اترنے کی طاقت دے اور ہمیں مل جل کر اپنے دین کی خدمت کا موقع فراہم کرے۔ یہاں تنہائی میں زندگی منتشر اور بکھری ہوئی سی معلوم ہوتی ہے۔

ترجمان کا تازہ پرچہ آگیا ہے۔ مدراس اور حیدر آباد کے اجتماعات کی روداد اس میں شامل ہے۔ بہت عمدہ روداد ہے اور مولانا کی تقریریں تو بے نظیر ہیں۔ ایک نئی بات یہ ہے کہ مدراس کے اجتماع میں مسلم لیگیوں نے گڑبڑ کرنے اور فساد کرنے کی کوشش کی۔ یعنی جو کام غیر مسلموں کے کرنے کا تھا وہ مسلمانوں نے کیا لیکن اس فساد میں جماعت کا طرز عمل مثالی اور دیکھنے کی چیز ہے۔ آزمائشیں بہت تیزی سے قریب آرہی ہیں۔ اللہ تعالےٰ ہمیں ہمت دے۔

میں یہ پرچہ بھی تمہیں پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ ویسے خدا کرے کہ یہ پرچہ تم یہیں آکر پڑھو۔ بہت دنوں کے بعد ملک نصر اللہ خان عزیز کا اخبار کوثر بھی آیا ہے۔ تمہارے لیے سب پرچے جمع کیے جا رہا ہوں۔

دکان کی فکر نہ کرو۔ دکان آہستہ آہستہ چل ہی رہی ہے۔ چوہدری علی احمد خاں کے ساتھ بل کر دعوتی ملاقاتوں کے لیے بھی روزانہ جاتا ہوں۔ دوکان

انشاءاللہ چل جائے گی اب بھی اس کی بکری کبھی کبھی ۳۰، ۴۰ روپے تک ہو جاتی ہے ۔ فسادات کے ان دنوں میں یہ غنیمت ہے ۔ اطمینان رکھو ۔ اللہ اپنے بندوں کے لیے بہتری کی صورت خود پیدا کرتا چلا جائے گا ۔

پھلور ۲۸ جولائی ۴۷ء

۶۱

خط ملا جب کہ میں لدھیانہ آنے کے لیے پا بر کاب تھا اور بھائی جان کو جالندھر سے ایک دن کے لیے بلا کر دکان پر بٹھایا تھا تاکہ دکان بند نہ رہے ۔

اب تم کہتی ہو کہ فی الحال میں لدھیانہ میں ہی رہوں گی اور آنا نہیں چاہتی ہو ۔ ساون کے موسم کی طرح تمہاری طبیعت ہو گئی ہے ۔ کبھی کچھ کہتی ہو اور کبھی کچھ کہتی ہو ۔ اگر تم اسی طرح رائے بدلتی رہو گی تو بتاؤ میں کسی فیصلے اور نتیجے پر کیسے پہنچ سکتا ہوں ۔ کسی نے دو تلخ باتیں کہہ دیں تو اٹھا کر لکھ دیا کہ مجھے آ کر لے جاؤ کسی نے دو باتیں میٹھی کر دیں اور تم خوش ہو گئیں تو لکھ دیا کہ فی الحال ٹھہر جاؤ میں وہاں اداس ہو جاؤں گی طبیعت کا یہ رنگ انسان کے ارادے کے لیے مفید نہیں ہے ۔ کوئی ہنس کر بول دیا تو بکھر گئے کوئی تلخ بول پڑا تو سکڑ گئے ۔ نہیں جی یہ طریقہ غلط ہے اپنا فیصلہ اور اپنا ارادہ ہونا چاہیئے اور اسی سے انسان کوئی کام کامیابی سے کر سکتا ہے جو اپنے فیصلوں کو دوسروں کے مزاج کے سہارے ہر وقت بدلتا ہے وہ اس اپاہج کی طرح ہے

جو لاٹھی کے بغیر چل نہیں سکتا۔

جب تم نے لکھا کہ میں جلد آنا چاہتی ہوں تو میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ خط ملتے ہی اسی شام کی گاڑی سے لدھیانہ آ کر تمہیں لے جاؤں۔ لیکن پھر میں نے دکان کو کھلا رکھنے کیلئے بھائی جان کو خط لکھا کہ وہ اتوار کو پہلی گاڑی سے پھلور آ جائیں اور آ کر دکان میں بیٹھیں کیوں کہ مجھے لدھیانہ جانا ہے چنانچہ وہ اتوار کی صبح کو گاڑی سے پھلور آ گئے۔ اور کہنے لگے کہ تم زبیدہ کو جا کر لے آؤ۔ ہم سب واپس جالندھر چلیں گے۔ چھوٹا محمود بھی ساتھ آیا تھا۔ وہاں بھابی بھی منتظر تھیں لیکن اتنے میں ڈاکیے نے تمہارا خط لا کر دیا۔ غرض میرا بنا بنایا پروگرام ٹوٹ گیا اور کوفت بھی ہوئی۔ بار بار پروگرام بدلنے سے انسان کی قوت ارادی کمزور ہو جاتی ہے کل کا دن پھر ہم نے مکان کی تلاش میں گزارا۔ دو مکان ایسے ملے ہیں جن میں پانی نہیں ہے پانی والا مکان ایک مہینے تک مل سکے گا۔ اب میں نے تو مکان کے لیے صرف ایک ہی شرط رکھی ہے یہ کہ وہ باپردہ ہو۔ اور مجھے امید ہے کہ وہ بہت جلد مل جائے گا۔

تم نے بعض عزیزوں کی ناروا باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ مجھے ان باتوں کی پرواہ نہیں ہے خوبی کی باتیں ہوں یا خرابی کی، اگر وہ کسی میں حقیقتاً پائی جاتی ہوں تو وہ خود اس قابل ہیں کہ اصلاح کی خاطر تشہیر کر دی جائیں لیکن اگر وہ باتیں کسی شخص میں موجود ہی نہ ہوں تو کہنے والا اپنی قبر خود ہی آگ سے بھرتا ہے۔ ہم کو اس سے کیا؟

غیبت اور کسی کی برائی کرنے والا دوسرے کی برائی بھی سمیٹتا ہے یہ کیا کم کسی کا احسان ہو گا کہ وہ ہماری غلطیوں اور کمزوریوں کا گناہ بھی اپنے سر لیتا رہے کسی مسلمان بھائی کا گوشت اگر کسی کو بہت مرغوب ہے تو ایسے آدم خور درندوں کی ہمیں کیا پرواہ ہو

سکتی ہے۔ سب سے زیادہ دکھ وہی شخص اٹھاتا ہے جو ہر بات پر چڑتا ہے، چونکتا ہے، ناک بھوں چڑھاتا ہے، اور چیختا ہے کہ ہائے فلاں نے یہ بات کیوں کہہ دی۔ وہ شخص بہت مزے میں رہتا ہے جو یہ کہہ کر اپنے راستے پر چلتا رہتا ہے کہ چلتے قافلوں پہ کتے بھونکتے ہی رہتے ہیں انہیں بھونکنے دو۔ ایسی باتوں سے ناواقف بن کر رہو۔

تم نے کبھی کسی شخص کو کسی ناواقف شخص کی چغلی کھاتے دیکھا ہے بس آدمی ایسا ہی ہو جائے، باقی رہیں باتیں چغلیاں اور ان کی نوعیت تو مجھے ان کے جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے کون سا ان کے خلاف اعلانِ جنگ یا مدافعتی محاذ قائم کرنا ہے۔ ان کا راستہ اپنا ہے میرا راستہ اپنا ہے اور میں نے یہ راستہ سوچ سمجھ کر اپنایا ہے۔ جب کوئی شخص کسی کے نقص نکالنا ہی ٹھان لے تو پھر وہ ہیرے میں سے بھی اس کے نقص نکال لیتا ہے۔ لوگوں نے پیغمبروں میں بھی نقص نکالے اور ان کے مذاق اڑائے ان کی چغلیاں کیں ان کے خلاف سازشیں کیں تو پھر ہم کمزور انسان کہاں کے ایسے معصوم آئے ہیں کہ ہمارے خلاف کسی کا دل چاہے کہ کچھ کہے اور کہہ نہ سکے۔ اگر کوئی شخص کسی کی باتیں ادھر سے لاکر ادھر کردے تو اس سے کسی کا کیا بگڑ جاتا ہے۔ خود ایسا کرنے والے کا ضمیر ہی گندا ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ اپنے بندوں کو ہدایت اور دین کے راستے میں استقامت عطا فرمائے۔ گھبراؤ نہیں ذرا چند دن اور ہمت اور صبر سے کام لو شاید تم ان حالات کا اندازہ نہیں لگا سکتیں جن کا میں ان دنوں شکار ہوں۔ ۷ مئی کے بعد سے اب تک میں مسلسل مسافرت میں ہوں ۴ مئی کو دہلی سے چل کر پھلور آیا پھر ۷ مئی کو دکوہا پہنچا ۸ مئی کو دارالاسلام پٹھانکوٹ ۱۲ مئی کو لدھیانہ

۱۸ مئی کو واپس دہلی۔ وہاں کھانا بھی ہوٹل میں، کبھی دفتر میں، کبھی بازار میں، کبھی کوثر کے ساتھ کبھی ممتاز صاحب کے ساتھ، کبھی دودھ پی کر گزارہ کیا۔ ۵ جون کو پنجاب واپس آ گیا یہاں آ کر کھانے اور رہائش کی دِقّت دہلی سے بھی بڑھ گئی اب روزہ افطار کہیں کرتا ہوں کھانا کھاتا کہیں ہوں اور سوتا کہیں ہوں۔ ایک بے اطمینانی بے سکونی اور افراتفری ہے جس میں مسلسل گرفتار ہوں تم کم از کم والدین کے پاس اپنے گھر میں پُر سکون بیٹھی ہو اور میں اس پریشانی میں ہوں لیکن ان دِقتوں کا شکوہ مجھے اس لیے نہیں ہے کہ خدا کو یوں ہی منظور ہے جب وہ چاہے گا ان کو دور کر دے گا اور خود ہی فراخی اور سہولت پیدا کر دے گا۔

پھلور۔ ۳۰ جولائی ۴۷ء

---

(۶۲)

ملک کے حالات بگڑتے چلے جا رہے ہیں تم پریشان ہو اور میں اداس ہوں۔ بخدا میں ان دنوں بہت اداس ہوں۔ یہ ایک آزمائش ہے جس میں سے میں ان دنوں گزر رہا ہوں۔ دفتر والے بڑی شدت سے مجھے واپس بلا رہے ہیں بار بار لکھ رہے ہیں بہت سی ترقی کی امیدیں دلاتے ہیں۔ میری کمی کو شدت سے محسوس کرنے کا اظہار کرتے ہیں اور دہلی سے کراچی جانے کے لیے تیاری کے سلسلے میں میری پیشگی ضرورت کا حساب بھی پوچھ رہے ہیں۔

تم میکے میں ہو اور میں دوراہے پر کھڑا اور سرائے میں پڑا ہوں دکان چل ہی ہے بلکہ کھل رہی ہے البتہ فسادات کی گرمی کے سبب کاروبار ٹھنڈا ہے لیکن مکان نہیں مل رہا ہے۔ کھانے رہنے سونے اور وقت گزارنے کی بہت سی دشواریاں ہیں۔ یہ سب آزمائش ہے اور میری دعا ہے کہ میں اس آزمائش میں سے ایمان کی سلامتی کے ساتھ گزر جاؤں اور پورا اتروں میرے دل پر تنہائی کی آزمائش کا بوجھ ہے۔ میرے ذہن کو انتشار اور پراگندگی کی آزمائش ہے۔ رہائش اور بودوباش کے سلسلے میں بے گھری کے ذریعے سے میری آزمائش ہو رہی ہے اور مجھے قرآن کے وہ الفاظ یاد آتے ہیں کہ جنت کانٹوں میں گھری ہوئی ہے، لوگوں نے بڑی بڑی آزمائشوں میں کامیابی کے ساتھ گزارا کیا ہے اور امتحان پاس کیا ہے تو کیا ہم اس چھوٹی سی آزمائش کو بھی پاس نہ کریں گے۔ قرآن کے یہ الفاظ یاد آتے ہیں" کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ محض یہ کہہ کر کہ" ہم ایمان لائے " چھوڑ دیے جائیں گے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا حالانکہ ان سے پہلے بھی جس نے ایمان کا دعوے کیا ہے اس کو ہم نے آزمایا ہے پس ضرور ہے کہ اللہ دیکھے کہ ایمان کے دعوے میں سچے کون ہیں اور جھوٹے کون "۔ بس ان دنوں آزمائش کے اسی دور میں سے گزر رہا ہوں اور مجھے اس میں ثابت قدم رہنا ہے جب ایک طرف مصیبت تکلیف اور آفت نظر آئے اور دوسری طرف آرام اور راحت نظر آئے اور جب انسان دونوں کو تول کر صحیح راستے کو مقام لے چاہے وہ مصائب تکالیف اور آفات کا ہی راستہ کیوں نہ ہو تب وہ کامیاب ہوتا ہے ورنہ باتیں کرنے کے لیے تو ہر شخص کے منہ میں ایک زبان موجود ہے۔

تم اپنی پریشانی کا اظہار کر رہی ہو۔ میکے میں رہے جانے پر شرمندہ سی ہو تمہاری

دقتوں اور ذہنی پریشانیوں کا مجھے احساس ہے ۔ لیکن میری زندگی ! مسلمان یوں ہی زندگی گزارا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے صاف کہہ دیا ہے کہ ہم اپنے بندوں پر ان کی وسعت سے زیادہ بار نہیں ڈالتے ۔ پھر سمجھ لو کہ جو کچھ بھی آتا ہے جو کچھ بھی سہنا پڑتا ہے ہر دقت ہر پریشانی ہر مصیبت ہر انتظار ہر آفت اور ہر آزمائش ہماری وسعت کے اندر ہی ہے کہ اسے برداشت کرتے جائیں ۔ یہاں تک کہ اگر مسلمان دم بھی توڑ دے تو بھی وہ فریاد کرکے اور مایوسی اور غم کا اظہار کر کے ناشکری کا مرتکب نہیں ہو سکتا ۔ اس آزمائش گاہ میں ہر شخص آزمائش میں سے گزرتا ہے اور جتنا کسی کا ظرف ہوتا ہے اسے اتنی ہی آزمائش میں ڈالا جاتا ہے یہ آزمائش ابدی نہیں ہوتی ہے ۔ گزر جانے کے بعد انسان بھول بھی جاتا ہے لیکن نامۂ اعمال میں اس کے صبر یا بے صبری شکر یا ناشکری کا پورا پورا حساب درج ہو جاتا ہے جو روزِ حساب اس کے سامنے پیش کر دیا جائے گا ۔ اس روز کا خیال رکھو اور صراطِ مستقیم پر رہنے کی میرے اور اپنے لیے اللہ پاک سے مسلسل اور متواتر دعا کرتی رہو ۔

تم کبھی کہتی ہو کہ آکر لے جاؤ اور کبھی کہتی ہو کہ میں آنے کے لیے تیار نہیں ۔ یہ تلون مزاجی کیا ہے آتا ہے تو جس حال میں ہو اسی حال میں شرکت کے لیے یہاں آجاؤ ۔ اگر اس درویشی سے گھراتی ہو تو پھر صبر کے ساتھ وہاں بیٹھ کر تماشہ دیکھو ۔ تم لڑکیوں میں ایک عجیب کمزوری ہوتی ہے جو سب میں عام ہے اور اسے دور کرنا بڑے پختہ ارادے کا کام ہوتا ہے کسی کی دو میٹھی باتوں پر اپنا سارا سہارا اسی کو سمجھ لینا اور پھر اس کی دو تلخ باتوں پر اسے قطعی ناقابلِ برداشت بھی قرار دے لینا ۔ تم نے شدت سے لدھیانہ سے پھلور آجانے کا فیصلہ کیا تھا پھر تم نے اتنی ہی شدت سے وہیں رہنے کا فیصلہ بھی سنا دیا

اب تم دوبارہ لکھ رہی ہو کہ اگر آپ آ جاتے تو میں چلی ہی جاتی۔ یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر میں لینے کے لیے آ جاتا تو تمہیں ضرور لے ہی جاتا لیکن جب تم نے پہلے ہی لکھ دیا کہ میں ہرگز جانا نہیں چاہتی تو میں نے تمہارا دل دکھانا پسند نہ کیا عورتوں کے فیصلوں کا یہی وہ کچا پن ہوتا ہے جس سے مرد کا ارادہ بھی ڈانواڈول اور متزلزل ہو جاتا ہے۔

ان دنوں بعض لوگوں کو دینی کتابیں پڑھانے کی کوشش کر رہا ہوں چونکہ یہ تبلیغ ہے اس لیے ہر شخص کا ہم پر حق ہے۔ ایک صاحب کو ایک کتابچہ "نظام اطاعت کی تین کڑیاں" دیا تھا بہت دنوں کے بعد ے کر آنے میں سے پوچھا تو ٹال گئے چودھری صاحب اور میں نے تبلیغ کا یہ سسٹم رکھا ہے کہ جسے کوئی پمفلٹ یا کتاب دی جاتی ہے بعد میں اس کا خلاصہ اس سے ضرور پوچھا جاتا ہے اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس نے پڑھا ہے یا نہیں پڑھا۔ ان دنوں لوگ کچھ روکھے اور پھیکے سے ہو گئے ہیں اور کچھ چکنے گھڑے بن گئے ہیں کہ ہر بوند پھسل جاتی ہے تحریک اسلامی کے لیے تبلیغ میں تو معاشرے کے ملبے میں سے سالم اینٹیں تلاش کرنے کا کام ہے جو صبر طلب بھی ہے مشکل بھی ہے اور طویل بھی۔ بہر حال ایک روز ایک گروہ ایسا تیار ہو جائے گا جو قوت بن کر ابھرے گا ابھی تو بنیاد بھرنے کے لیے ابتدائی اینٹیں ہی جنی جا رہی ہیں ہم تو وہ لوگ ہیں جو اسلامی نظام کی عمارت کی بنیادوں میں روڑی بن کر کھپ جانے والے ہیں۔ عمارت انہیں بنیادوں پر کھڑی ہوتی ہے لیکن وہ بنیادیں کسی کو نظر نہیں آتیں اسی لیے ان کا اجر بھی سب سے زیادہ ہوتا ہے۔

پھلور۔ یکم اگست ۷۶ء

۶۳

فسادات کی آگ ہر طرف پھیلتی جا رہی ہے۔ لساڑہ، مئو اور خود لدھیانے سے خبریں آ رہی ہیں کہ اب انسان شیطان کے جنگل میں چلا گیا ہے اور جنگل کا درندہ بن گیا ہے۔ اب تمہارا لدھیانہ میں رہنا مجھے کسی طرح منظور نہیں ہے۔ پھلور میں ہندو سکھوں اور مسلمانوں کی مشترکہ امن کمیٹی بنی ہوئی ہے جس کے ممبر چودھری علی احمد خان بھی ہیں اور میں بھی اس سے وابستہ ہوں۔ رات میں اور وہ پہرے کے لیے نکلتے ہیں تاکہ غیر مسلموں کے ارادوں سے آگاہی رہے۔ غیر مسلموں کے محلوں کا بھی گشت کرتے ہیں۔ کل میں اور چودھری صاحب نے ایک ہندو محلّے کا دورہ کیا تو چوک میں غیر مسلموں کا ایک بہت بڑا مجمع بیٹھا تھا جو فسادات کے بارے میں سوچ بچار کر رہا تھا انہوں نے ہمیں دیکھ کر بڑے احترام سے بٹھایا لیکن ہم نے محسوس کیا کہ ان لوگوں کے تیور اور ارادے اچھے نہیں ہیں۔ پھلور پر باہر سے حملے کی خبریں برابر آ رہی ہیں۔ سکھوں کے جتھے آس پاس گاؤں پر حملے کر رہے ہیں مسلمان اجڑ اجڑ کر ذخیرے کے شمالی جانب کھیتوں میں جمع ہو رہے ہیں وہاں اجڑے ہوئے مسلمانوں کا بس ایک کیمپ سا بنتا جا رہا ہے۔

اب میرے نزدیک تمہارا لدھیانہ میں رہنا سخت نامناسب ہے بلکہ بی بی اور لڑکیوں کا بھی وہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے جب کہ اباجان کا تبادلہ پاکستان میں ہو گیا ہے اور وہ چلے گئے ہیں ظاہر ہے کہ اب پاکستان بن چکا اور اس کا

اعلان ۱۴ اگست کو ہو رہا ہے اس لیے اب میں کل پرسوں تک لدھیانہ آ رہا ہوں تم لوگ سب تیار رہو تاکہ میں تم سب کو پھلور لے آؤں یہاں ہمارے اثرات بہتر ہیں میری رائے میں مرنے جینے کا اکٹھا ہی سامان ہو تو بہتر ہے اس لیے اب لدھیانہ میں مزید قیام کسی صورت بھی مناسب نہیں ہے۔ میرا انتظار کرو میں آ رہا ہوں۔

پھلور۔ ۳ ، اگست ۴۷ء

پاکستان کے جہاں نویس

۴۴

شور کوٹ ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانے میں بیٹھا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں۔ میرے چاروں طرف لدھیانہ جالندھر اور مشرقی پنجاب کے دیگر اضلاع سے آئے ہوئے مہاجرین کا ایک ہجوم ہے۔ بچے بلک رہے ہیں عورتیں خستہ حال اور درماندہ ہیں مرد پریشان اور بے منزل ہیں، کسی کی کوئی متعین منزل نہیں ہے ہر طرف انسانیت آوارہ بے سہارا اور بے آسرا پڑی ہے۔

تمہیں سرگودھا میں اباجی کے پاس چھوڑ کر آیا ہوں تو گزشتہ مہینہ بھر کی ہولناک روداد ایک دہشتناک خواب کی طرح میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔ تم سے صبح رخصت ہو کر جی پی او کے کوارٹروں سے پیدل ریلوے اسٹیشن تک پہنچا تو اسٹیشن حسب معمول مہاجرین کے ٹڈی دل سے اٹا پڑا تھا جن میں سے ایک میں بھی تھا۔ کسی طرف جانے کے لیے کوئی گاڑی نہ تھی۔ گھنٹوں انتظار کیا۔ بار بار جی چاہا کہ واپس تمہارے پاس پہنچ جاؤں لیکن عافیت کا یہ راستہ مجھے پسند نہ آیا چنانچہ بیٹھا رہا یہاں تک کہ ایک ریلوے انجن شور کوٹ روڈ کی طرف جانے کیلئے پلیٹ فارم پر آ کر دھواں اڑانے لگا۔ بہت سے لوگ اس کی طرف جھپٹے۔ زیادہ تر لوگ شور کوٹ کے راستے لائل پور جانا چاہتے تھے ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ کوئلوں کے ڈھیر پر جگہ ملی۔ اسی کو تخت سلیمانی قرار دے کر بیٹھ گیا اور انجن سیٹی دے کر روانہ ہو گیا۔ دوپہر کو جھنگ سے گزر کر دریام کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو

ڈرائیور نے سب کو اتار دیا کہ اب آگے ہمیں لے جائیں گے۔ وریام میں کئی گھنٹے تک انتظار رہا یہاں تک کہ ایک گاڑی سرگودھا کی طرف سے ہی آئی جس میں چھت سے لے کر بمپر تک انسان اس طرح چمٹے ہوئے تھے جیسے گڑ پر چیونٹیاں جمع ہو جاتی ہیں۔ تم نے بطور کیمپ سے روانگی کے وقت میری برق رفتاری کے جوہر دیکھے تھے چنانچہ میں بھی اس گاڑی پہ لد گیا اور اب مغرب کا وقت ہو رہا ہے اور مسافر خانے کی دھیمی اندھی روشنی میں بیٹھا تمہیں یہ خط لکھ رہا ہوں۔

سنا ہے کہ کل صبح یہاں سے ایک ٹرین لائل پور کی طرف جائے گی جس پر سوار ہو کر عباس پور پہنچوں گا اس لیے میرے پاس یہ پوری رات فارغ ہے اور ان دنوں انسان کے بعد سب سے زیادہ ارزاں اگر کوئی چیز ہے تو وہ وقت ہے چنانچہ ہر شخص کے پاس حوالات کے وقت کی طرح سونے۔ اونگھنے۔ پریشان ہونے۔ لڑنے۔ جھگڑنے رونے دھونے اور بچھڑے ہوؤں کو یاد کرنے کے لیے وافر وقت موجود ہے۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ

ے منزل کے آس پاس کہیں راہ گزر پہ ہم
کچھ ریت کے گھروندے بنا کر گرا چکے

لیکن یہ بات گھروندوں کے گرنے کی نہیں ہے بلکہ خوابوں کے محلات سے لے کر حقیقی محلات تک سب کچھ ہی تو گر چکا ہے۔ ایسے ایسے حوادث گزشتہ دنوں میں گزر گئے ہیں کہ انسان کو اپنی سخت جانی پر خود پختہ یقین ہو گیا ہے۔

ے ذکر سے جن حادثوں کے سانس رکتی تھی کبھی
وقت کی مجبوریوں میں سب گوارا ہو گئے

گزشتہ پورا مہینہ ایک ہولناک خواب کی طرح گزرا ہے اپنی ذات اور پوری انسانیت اس کرۂ ارضی پر تلپٹ ہو کر رہ گئی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں پنجاب کی سرزمین کا تختہ الٹ گیا ہے اور درمیان سے یہ ٹکڑا اس طرح ٹوٹا ہے ۔ جیسے کوئی جہاز درمیان سے شق ہو کر سمندر کی تہہ میں بیٹھ جائے ۔ مشرق کے باشندے مغرب میں آ گرے ہیں اور مغرب کے باشندے مشرق کی طرف جا گرے ہیں ۔ اس ہولناک تباہی کو نہ ناپا جاسکتا ہے نہ تولا جاسکتا ہے نہ بیان کیا جاسکتا ہے اور نہ تاریخ کے دامن میں ہو بہو سمیٹا جاسکتا ہے ۔ یہ تباہی مثالی منفرد اور مکمل ہے اور اس طرح یہ تاریخِ انسانیت کا عظیم المیہ مرگِ انبوہ بن کر جشنِ مرگ کی صورت اختیار کر گیا ہے ۔

چند دن پہلے کہاں ہم پھلور میں مکان تلاش کر رہے تھے اور کہاں پھلور کا ہر مکان اب ہمیں تلاش کر رہا ہے گیلانی اسٹور بھی اس تباہی کے ملبے میں ایک ذرے کی مانند کھو گیا ہے اور چوہدری علی احمد خان کا اسلامی ہوٹل بھی ، جو پھلور میں نظریاتی بحثوں کا مرکز تھا تلپٹ ہو کر صفحۂ ہستی سے صاف ہو گیا ہے ۔ زمانے کی ایک کروٹ انسانیت کے کروڑوں ذرہ ہائے حیات کو ملیا میٹ کر کے اس طرح گزر گئی ہے کہ انسانیت تو خون میں غلطاں تڑپ رہی ہے اور تباہی کی لہر زمانے کے سمندر میں واپس جا کر چپ چاپ معمول کے مطابق بہہ رہی ہے ۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے البتہ ساحلِ سمندر پر اب کوئی گھروندہ سالم نہیں رہ گیا ہے ۔

حقارت سے نہ دیکھو اہلِ ساحل اہلِ طوفاں کو

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ساحل ڈوب جاتا ہے

اور رونبا نے دیکھ لیا کہ یہاں سارے کا سارا ساحل ڈوب گیا ہے پھلور لدھیانہ جالندھر دہلی کہاں گئے زمانے کی لپیٹ میں آ کر چینی کے کچے برتنوں کی طرح ٹوٹ گئے ہیں جو بہت نزدیک تھے وہ بہت دور رہ گئے ہیں اور جو بہت دور تھے وہ بہت نزدیک آ گئے ہیں۔ اس خطے پر سے ایک چھوٹی سی قیامت اپنی ساری فتنہ سامانیوں کے ساتھ گزر گئی ہے اور جو کچھ باقی بچا ہے وہ ملبہ اور تباہی ہے۔

رہ رہ کر خیالات کے مرغولے میرے ذہن پر سے بھادوں کے بادلوں کی طرح گزرتے چلے جا رہے ہیں اور ان خیالات میں مداخلت کرنے کی اس بھرے پُرے مسافر خانے میں کسی کو جرأت نہیں ہے۔ شور اور سسکیاں اور ماؤں کی بچوں کے نام پکاریں تو ہر طرف سے آ رہی ہیں لیکن یہ میرے کان کی بیرونی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر نیچے گر جاتی ہیں میری یکسوئی اور ذہنی خلوت میں داخل ہونے کی کسی کو بھی جرأت نہیں ہے۔ تم حیران ہو گی کہ میں اتنا طویل خط تمہیں ایک کھلے مسافر خانے میں ہجوم سوگواراں کے درمیان بیٹھ کر لکھ رہا ہوں جس کے ایک کونے میں اپنی زندگی میں پہلی بار تنہا اکڑوں ایک بنچ پر بیٹھا ہوا ہوں۔

تم یاد آ رہی ہو بھائی جان یاد آ رہے ہیں اور بہت سے وہ لوگ جو اس ہنگامے میں بچھڑ گئے ہیں یاد آتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ نامعلوم لوگ بھی یاد آ رہے ہیں جو بیاس کے آس پاس پاکستان کے شوقِ فراواں میں کٹ گئے اور بیاس کی لہروں کے ابھرے ابھرے آبی گالوں کو اپنے خون کی سرخی عطا کر گئے وہ بھی یاد آ رہے ہیں جو ابھی تک کیمپوں میں ہیں اور دشمنوں کی دہشتناک یلغار میں گھرے ہوئے ہیں۔ پھلور کے ذخیرے کے کیمپ میں پندرہ دن کا قیام یاد آ رہا ہے جب

ہمارے سروں پر صرف آسمان تھا جو برستے بادلوں سے بھرپور تھا اور نیچے پانی کیچڑ گوبر بدبو اور روتے چیختے بچے اور سہمے سہمے انسان تھے جہاں چند مربع فٹ کے رقبے میں چادروں کی چار دیواری میں تین چار خاندان سمٹے بیٹھے تھے اور بارش اس طرح برس رہی تھی کہ جیسے دنیا پر آخری بار برس رہی تھی تو وہ اجڑے ہوئے لوگوں کی بھرپور گاڑیوں کا ہمارے پاس سے سینے پر مونگ دلتے ہوئے گزرتے چلے جانا یاد آرہا ہے، تمہارا پھونکیں مار مار کر گیلے چولہے میں آگ جلانا اور آنکھیں سجانا یاد آرہا ہے پھر پاکستان سے آنے والی کنوائے میں لوگوں کا سپاہیوں کو رشوتیں دے دے کر بیٹھتے چلے جانا اور ہمارا بار بار ہر کنوائے سے پیچھے رہ جانا اور مضطرب ہو ہو کر مایوس ہونا یاد آرہا ہے۔ پھر پندرہویں دن آنے والے کنوائے میں میرا منتظمین کی ہر رکاوٹ سے بے نیاز ہو کر تم لوگوں کو گاڑی میں زبردستی لاد دینا اور خود بس کی چھت پر روکنے کے باوجود چڑھ جانا یاد آرہا ہے پھر وہ سفرِ پاکستان جو صبح آٹھ بجے شروع ہوا اور وہ گاڑی جو اس طرح چلتی رہی جیسے بازیگر رسی پر چلتا ہے یاد آرہا ہے جب وہ جالندھر اور امرتسر میں سکھوں کے جھمگھٹوں کے درمیان بار بار رک جاتی تھی اور میں اپنے کانوں سے ان کی گالیاں سن رہا تھا اور رات کے دو بجے تک اندھیرے میں بس کا پاکستان کی طرف سفر اور سڑک کے کنارے بھارت میں رہ جانے والے درختوں کی ٹہنیوں کا چھت پر بیٹھے ہوئے ہر دردمند مہاجر کو طمانچے مار مار کر مزید دردمند بنانے کا عمل یاد آرہا ہے۔ پھر بس کا واہگہ بارڈر سے ایک میل دور خراب ہو جانا اور پھر ہمارا بس کو میل بھر خود دھکیل کر واہگہ بارڈر تک لانا اور نہر پار کر کے پاکستان میں داخل ہونا یاد آرہا ہے پھر جب ہم پاکستان میں داخل ہوئے تو تمہیں یاد ہوگا کہ کس طرح ساری

بستی کی دہشت کا بوجھ پل بھر میں اتر گیا تھا اور ہم نے رات کے دو بجے سڑک کے کنارے چادریں بچھا کر رات بسر کی تھی پھر صبح ہم بسوں میں لد کر لاہور اسٹیشن پر پہنچے تھے تو وہاں انسانوں کا ہجوم قیامت کا منظر پیش کر رہا تھا پھر کس طرح قیامت کے اس ہجوم میں ماموں جعفر مل گئے تھے جیسے بادلوں کے ہجوم میں عید کا چاند مل جاتا ہے اور ہم دو دن کے لیے راجگڑھ میں ان کے پاس چلے گئے تھے جہاں پہلے سے بیسیوں افراد موجود تھے پھر کسی منزل پر پہنچنے کے خیال سے ہم بسوں کے ذریعے لائل پور اور پھر عباس پور چلے گئے پھر عباس پور میں بھائی حسن محمدؐ کے مکان پر چند دن کے قیام کے بعد اباجی کے بلاوے پر میں تمہیں سرگودہا چھوڑنے کے لئے چلے آیا اور تمہیں وہاں پہنچا کر اب میری عباس پور کی طرف واپسی، ہولناک ماضیٔ قریب کی ریل فلم کی طرح میرے تصوّر کے پردے پر مسلسل چل رہی ہے اور میں شورکوٹ کے اس مسافر خانے میں بیٹھا تمہیں یاد کر کے وقت گزارنے کے لیے یہ خط لکھ رہا ہوں۔

دیکھو اس طرح زمانے نے کروٹ لی ہے اور جب زمانہ کروٹ لیتا ہے تو انسانوں کی وہ نسل جو اس کروٹ کے وقت زمین کے سینے پر چل پھر رہی ہوتی ہے گیہوں کے دانوں کی طرح پس جاتی ہے۔ لیکن ہم تو بہت سخت جان لوگ ہیں ابھی ہمارا ماضی تو بہت تھوڑا ہے حال صرف ایک لمحے کا نام ہے اور سارا مستقبل افق تا افق ہمارے سامنے پڑا ہے اور ہمیں اب اس پاکستان میں اپنے خوابوں کا تاج محل تعمیر کرنا ہے ہمیں یہاں وہ مثالی اسلامی نظام لانے کی کوشش کرنا ہے جس کے لیے زندگی کے تلخ و شیریں سارے ہی تجربات میں سے گزرنے کے لیے ہم تیار ہیں بتاؤ تم بھی تیار ہو یا نہیں مجھے یقین ہے کہ تم میرے ساتھ ساتھ تیار ہو۔

اب یہ وہ ملک ہے جو ہماری جد وجہد کی آماجگاہ ہوگا جس کے درو دیوار میں ہمیں اپنے خوابوں کے نظام کا رنگ بھرنا ہوگا۔ ابھی تو یہ ملک نظریئے کا ایک سادہ خاکہ ہے اس میں ہمیں اپنے عمل اور جد وجہد سے اپنے تصورات کا رنگ بھرنا ہے۔ یہ رنگ بھرنا کوئی آسان کام نہیں ہے اس راستے میں بدر و احد کے معرکے ... بھی سامنے آ جائیں گے اور زمانے کے فرعونوں سے بھی واسطہ پڑے گا تم جانتی ہو کہ اس قوم نے آزادی حاصل نہیں کی ہے بلکہ آزادی اس پر گر پڑی ہے ابھی تو اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ آزادی اور مقصدِ حیات کے تقاضے کیا ہوتے ہیں۔

قومیں اگر نظریئے کی خاطر شعوری جد وجہد کے بغیر آزاد ہو جائیں تو ان کی آزادی اڑتے پنچھی کی طرح دروازے سے داخل ہو کر کھڑکی سے باہر نکل جاتی ہے ہمیں اس آزادی کو پائیدار بنانے کے لیے اس میں اسلام کے تصورِ حیات کا رنگ بھرنا ہوگا۔ وہ رنگ بھرنے کے لیے کیسے کیسے معرکے درپیش ہوں گے اور ابھی تو ہم پلیٹ فارموں کے مسافر خانوں میں ہی پڑے ہیں شاید آگے چل کر جیلوں کے دروازے بھی کھلیں گے بہرحال جو کچھ بھی کھلے گا اس کے لیے ہمارا دل بھی کھلا ہوا ہے۔

اس کسمپرسی میں ہمارا الگ الگ ہونا صرف چند دنوں کی بات ہے میں بہت جلد کوئی راستہ نکال لوں گا کہ ہم کس جگہ مل کر رہ سکیں۔ چوہدری علی احمد خاں صاحب کا تقاضا ہے کہ لاہور میں مہاجرین کے امدادی کیمپ میں کام کروں ابھی کچھ دنوں تک وہاں بھی جاؤں گا اس کے بعد پھر آگے کا راستہ سوچیں گے اور دیکھیں گے۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ اس نئے ملک میں اسلامی نظام کو کس طرح لایا جا سکتا ہے۔ مسلم لیگ اپنا کام کر چکی اب اس کے انحطاط کا عمل شروع ہوگا اب یہ جماعت اسلامی کی ذمہ داری

ہے کہ وہ اس مملکت کے ادھورے خاکے میں نظریاتی عمل کا رنگ بھرے اس کے لیے مجھے اور تمہیں ابھی سے کمرِ ہمت کس لینی چاہیئے۔ ہمت کرو اور آنے والے حالات کے لیے تیار ہو جاؤ دنیا کا مستقبل بھی ہمارا ہو گا اور انشاءاللہ آخرت کا مستقبل بھی ہمارا ہی ہو گا۔

کوئی تصویر نہ ابھری تیری تصویر کے بعد
ذہن خالی ہی رہا کاسۂ سائل کی طرح

شورکوٹ ریلوے اسٹیشن مسافر خانہ ۔ ۲ ر اکتوبر ۱۹۴۷ء

۶۵

دوسرے دن بھی گاڑی نہیں آئی۔ یہ خط بھی شورکوٹ سے ہی لکھ رہا ہوں سنا ہے کہ آج رات کو گیارہ بجے گاڑی ملے گی یعنی تم سے جدا ہو کر چوتھے روز میں لائل پور پہنچوں گا اب تک سرگودہا سے روانہ ہوئے ۴۸ گھنٹے گزر چکے ہیں اور لائل پور کا سفر جاری ہے۔

اس مصیبت عظمیٰ کے دوران میں یہ پہلا موقع ہے کہ ہم جدا ہیں دل کا عجب حال ہے بہت متاثر ہے معلوم ہوتا ہے کہ جسم کو روح کے بغیر گھسیٹ کر کہیں اور لیے جا رہا ہوں۔ سحری کے وقت نوافل پڑھتے ہوئے تو مجھ پر اتنی رقت طاری ہوئی کہ سنتیں پڑھنے کا بھی ہوش نہ رہا۔ فرضوں کی دوسری رکعت میں جا کر کہیں

کچھ سنبھلا۔ ایک ڈاڑھی مونچھ والے مرد سے ایسی بات سن کر پریشان نہ ہونا۔ دل ہی تو ہے، کوئی سنگ وخشت تو نہیں ہے لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پیمانہ چھلک چکا۔ اب گویا آنسو دل کی طرف لوٹ گئے ہیں جو آنسوؤں کا ایک تالاب بنا ہوا ہے۔ توڑ پھوڑ کے اس طویل عمل میں یاد بڑی خطرناک شے ہے جو انسان کو بار بار زخمی کرتی رہتی ہے۔ انسانوں کی اس عظیم مصیبت میں ہماری مصیبت تو بہتے دریا میں بس بلبلے کی مانند ہے اس لیے غم کا ہے کا۔ اللہ کی مصلحتیں عظیم ہیں اس کی مصلحتوں کے سامنے سر جھکائے بغیر چارہ نہیں۔ اس وقت ضبط اور تحمل سب سے بڑی چٹان ہے جس سے جذبات کی کشتی باندھی جا سکتی ہے۔

اس وقت میں شورکوٹ کے اسٹیشن کے سامنے ایک چھوٹی سی مسجد میں بیٹھا ہوں یادوں کے بوجھ اور دلوں کے دکھ کا علاج نماز ہی ہے لیکن وہ بھی اس وقت یوں محسوس ہوتی ہے جیسے جلی ہوئی انگلی کو پانی میں ڈبو دیا جائے۔ پانی سے باہر آتے ہی جلن پھر تیز ہو جاتی ہے۔ میری ساری امیدیں اسی پاک پروردگار سے وابستہ ہیں جو میرے دل کی کیفیت سے صحیح طور پر واقف ہے اس کی رضا کے لیے ہمارے پاس تحفۂ صبر ہی ہے۔

> یہ حالات ایک بھاری آزمائش ہے جو مسلمان قوم پر ڈالی گئی ہے دعا کرو کہ ہم اس آزمائش میں پورے اتریں۔ اللہ سے پناہ مانگو۔ دینی امور کی پابندی میں کوتاہی نہ کرنا اور اس معاملے میں لاپرواہی کو قریب بھی نہ آنے دینا اس وقت تمہیں بعض ایسے لوگوں سے بھی واسطہ ہے جن کا یہ حال ہے کہ وہ نماز کے پابند کو نماز کا طعنہ دیتے، پردے کے پابند کو پردے کا طعنہ دیتے اور روزے کے پابند کو روزے

کا طعنہ دیتے ہیں۔ تمہیں ایسی صورت حال سے پورے صبر اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ نپٹنا ہے۔ میں تم پر مکمل بھروسہ اور اعتماد رکھتا ہوں کہ تم اس صورت حال سے بہت عزیمت اور خوبصورتی سے عہدہ برآ ہو سکو گی۔ اس زمانے میں جب مسلمان کہلانے والوں کا ہر طرف ہجوم ہے حقیقی مسلمان کا ہر طرف قحط ہے۔ ہم میں ہزاروں نقائص ہیں لیکن ہماری یہ کوشش اور تمنا ضرور ہونی چاہیئے کہ سچے مومن بن کر رہیں۔ ہمیں اپنے دونوں جہانوں کی تعمیر خود اپنے طرزِ عمل سے ہی کرنی ہے تم جانتی ہو کہ ہمارے دونوں جہاں مشترک ہیں اور یہ اشتراک ابدی ہے۔ یہ زندگی محض کوئی سوداگری تو نہیں ہے کہ رفتنی اور گزشتنی ہو، یہ تو اپنے اللہ کے ساتھ پوری روح اور جان کا سودا ہے ان میں سے کوئی مسلمان کچھ بھی بچا کر نہیں رکھ سکتا اور جس نے اس سودے میں سے کچھ بچا کر رکھ لیا بس وہی خسارے میں رہتا ہے۔

میری روح میں ایک بے کلی سی پیدا ہو رہی ہے ایک بے چینی سی ہے جس نے مجھے گھیر رکھا ہے۔ جہاں میں جا رہا ہوں وہاں بھی اطمینان کی کوئی رمق نظر نہیں آتی۔ یہ انقلاب جہاں نہ معلوم کہاں پہنچ کر رکے گا اور اس میں ہمارا مطلوبہ حصہ کیا ہو گا۔ اپنے خوابوں کا جہاں تعمیر کرنے کے لیے ایک عظیم جدوجہد کا میدان اس نئے ملک میں اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ اس جہانِ آرزو کی تعمیر کے لیے اپنی پوری قوت، پوری ہستی، اور سب کچھ لٹا دینا چاہتا ہوں۔ لکھنا پڑھنا بولنا کمانا غرض یہ کہ اپنا سب کچھ دین کی سربلندی کے لیے لگانا چاہتا ہوں کہ دین کی سربلندی اس نئے ملک میں ہو کر رہے۔ جو بھی ہو گا ہم ضرور ہی اس بلند مقصد کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔

ان دنوں گاڑیوں کا سفر تقریباً ناممکن سا بن گیا ہے ۔ سرگودہا سے یکم اکتوبر کو چل کر ۴ اکتوبر کو لائل پور پہنچنا واقعی دل گردے کا کام ہے اور یہ جہاد ان دنوں ہر شخص کر رہا ہے۔ ان دکھوں کے ایام سے گھبرانا نہیں اور اگر گھبراہٹ محسوس ہو تو نماز اور قرآن کی تلاوت سے بڑھ کر کسی شے میں تسکین نہیں ہے ۔ خدا کرے یہ خط تمہیں مل جائے ڈاک تو کیا اس دور میں تو ملک کا پورا انتظامی ڈھانچہ الٹ پلٹ ہو کر رہ گیا ہے اچھا اللہ مالک ہے اسی سے بہتری کی توقعات ہیں ۔

شور کوٹ روڈ ریلوے اسٹیشن ۔ ۳ اکتوبر ۴۷ء

---

(۶۶)

اس سے پہلے دو خط شور کوٹ ریلوے پلیٹ فارم سے لکھ چکا ہوں ۔ شاید مل گئے ہوں ۔ اب یہاں عباس پور پہنچ کر یہ خط لکھ رہا ہوں خدا کرے کہ یہ خط بھی تمہیں مل ہی جائے جس کی کم ہی امید ہے ۔

جب تمہیں سرگودہا اباجی کے پاس چھوڑ کر آیا تو تم بیمار سی تھیں خدا کرے اب تندرست ہو مجھے فکر ہے ۔ میں بھی یہاں بخیریت ہوں اگرچہ سخت اداس اور مضمحل پھلور کے کیمپ کی پندرہ روزہ حیوانی زندگی اور پھر بس کی چھت پر اٹھارہ گھنٹے کے سفر نے جو پھلور سے واگہ تک کا تھا چور چور کر دیا ہے حیرانی ہے کہ کیا سے کیا ہو گیا ہے ۔

مہاجرین کے قافلے آ رہے ہیں آنے والوں کی گاڑیوں کا عالم بھی نرالا ہے ہر تیسرے دن مہاجرین کی ایک گاڑی آتی ہے میں ہر بار اسٹیشن پر جاتا ہوں سخت انتظار میں ہوں کہ بھائی جان آجائیں وہ جالندھر میں پیچھے رہ گئے تھے اور اب تک نہیں آئے۔ ان کا دفتر جالندھر سے سیالکوٹ جانا تھا اگر وہ دس اکتوبر تک بھی نہ آئے تو پھر میں ان کی تلاش میں سیالکوٹ جاؤں گا۔ ہمارے قافلے کے دوسرے لوگ جو پیچھے رہ گئے تھے بھائی بشیر صاحب اور بھائی مسیح اللہ صاحب وہ بھی اب تک نہیں آئے ان کے بچے سخت پریشان ہیں بہن زبیدہ روز مجھ سے پوچھتی ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا جواب دوں۔ ہمارے قریب ملاں پور کا ایک گاؤں ہے وہاں سے سکھ ابھی چند دن ہوئے اٹھ کر گئے ہیں بعض لوگوں کی رائے ہے کہ میں وہاں جاکر مکان لے لوں لیکن ایسے لینے دینے پر دل بالکل آمادہ نہیں ہے لوگ سخت تباہی سے دوچار ہو گئے ہیں۔

میرا دل کوئی مکان یا سامان لینے پر آمادہ نہیں ہے بھائی جان آئیں تو کوئی پروگرام بنائیں گے۔ اللہ مالک ہے۔

تم آج کل جس حال میں ہو اس کا مجھے احساس ہے ایسی صورت حال بھی ہوتی ہے جس سے شیطان بھی پناہ مانگ سکتا ہے۔ مسلمان کے لیے سب سے بڑی چیز اس کی آبرو، ایمان، عزت نفس اور خودداری ہوتی ہے دنیا کو تو ہم نے اس چھوٹی سی عمر میں ہی خوب دیکھ لیا۔ اصلی سہارا تو خدا کا ہی ہونا ہے اب تو ہمیں ہمت سے حالات کا رخ بدلنا ہوگا حالات تو پہاڑ کی طرح سر پہ آپڑے ہیں۔ ہماری کامیابی اب اسی میں ہے کہ ہم صبر و استقامت کے ساتھ حالات کا سامنا کریں یہ آفت عام ہے

میں سوچتا ہوں کہ ہم تو پھر تعلیم یافتہ ہیں اور کچھ نہ کچھ دنیا کا تجربہ رکھتے ہیں ان کا کیا حال ہوگا جنہوں نے اپنے گاؤں سے باہر کبھی عمر بھر میں قدم بھی نہ رکھا تھا ان کا حال دیکھ کر حوصلہ پڑ گیا۔

بعض احباب مجھے کراچی بلا رہے ہیں لیکن میں ابھی کہیں نہیں جا سکتا جب تک خاندان کے سارے افراد واگہ پار کر کے ادھر نہ آ جائیں۔

عباس پور ۔ ۶ ، اکتوبر ۴۷ء

---

(۶۷)

۱۳ ، اکتوبر کو عباس پور سے چلا اور لائل پور پہنچا ۔ لائل پور سے ایک مختصر سا خط لکھا تھا ۔ شاید مل گیا ہو اگرچہ ان حالات میں توقع کم ہے ۔ ۱۴ ، اکتوبر کو لائل پور سے چل کر کل شام سیالکوٹ پہنچا ۔ میں یہاں بھائی جان کی تلاش میں آیا ہوں ۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ وہ یہاں ۱۰ ، اکتوبر کو آئے تھے اور ۱۳ ، اکتوبر کو لائل پور چلے گئے گویا ان کا اور میرا کراس کہیں سفر کے درمیان ہی ہو گیا ۔ اب وزیر آباد سے لائل پور کو گاڑی کل ڈیڑھ بجے جائے گی وہی گاڑی جس پر ہم لوگ گئے تھے اس لیے آج رات میں اپنے ایک دوست صوبیدار کے پاس ٹھہر گیا ہوں ۔ کل صبح سیالکوٹ سے ۸ بجے والی گاڑی سے چل کر ۱۰ بجے وزیر آباد پہنچوں گا اور وہاں سے ڈیڑھ بجے چل کر رات سات بجے لائل پور جا پہنچوں گا پھر لائل پور میں رات گزار کر صبح کی گاڑی سے ۱۸ ، اکتوبر کو واپس عباس پور پہنچوں گا ۔ پھر بھائی جان کے ساتھ بیٹھ کر ہی سوچیں گے کہ آئندہ کیا کرنا ہے ۔

مجھے تمہاری صحت کے بارے میں تشویش ہے ۔ خدا کرے کہ تم بالکل خیریت سے ہو سفر آج کل جہنم سے کسی طور کم نہیں ہے ۔ ارادہ تھا کہ بھائی جان سے مل کر لاہور مہاجرین کے امدادی کیمپ میں کچھ دنوں کے لیے کام کرتے چلا جاؤں گا لیکن اب بھائی جان سے ملے بغیر لاہور جانا دشوار ہے اس لیے واپس عباس پور جاؤں گا پھر ان سے مل کر اگلا پروگرام بناؤں گا ۔

تم گھبرانا نہیں اگرچہ ان حالات میں گھبراہٹ فطری سی بات ہے لیکن اللہ پر توکل اور بھروسہ اس سے بھی بڑی فطری بات ہے ۔ ایک مسلمان جب تک اپنے ایمان پر مضبوط رہتا ہے اور اپنے خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا احساس رکھتا ہے کبھی گھبراتا نہیں ہے ۔ میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ نہ تو اسلام کو صرف نام کا لیبل بنا کر زندگی کو غیر اسلام کے لیے وقف کیا جائے اور نہ اسلام کو خواب کی دنیا سمجھ کر عمل سے پہلو تہی کی جائے ۔ بلکہ اسے زندگی کی ایک عملی سائنس سمجھ کر اپنے آپ پر نافذ کیا جائے مسلمان ہونے کا میرے نزدیک یہی مفہوم ہے جس بات پر ایمان لاؤ اس پر زبان کی گواہی کے ساتھ ساتھ عمل کی گواہی بھی پیش کرو ۔

یہ وقت پوری مسلمان قوم اور اس قوم کے ہر خاندان اور خاندان کے ہر فرد پر مصیبت کا وقت ہے طوفان اور آندھی کی شدت میں جب چڑیوں اور بطخوں کا ایک جوڑا بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتا ہم ایک دوسرے سے دور پڑے ہیں ۔ یہ تو واقعی بڑی مصیبت کی بات ہے لیکن میں یقین رکھتا ہوں کہ انشاءاللہ مصیبت کا یہ دور بھی جلد گزر جائے گا ۔

تمہاری چند ایک چیزیں میرے سامان میں ہی رہ گئی ہیں ۔ آتے ہوئے لیتا آؤں

گا۔ فی الحال اس موسم میں تم میرا ہی سویٹر استعمال کرو۔ اس وقت میرے پاس صرف ایک ہی کمبل ہے جس سے گزارا ہو رہا ہے ابھی سردی بڑھی نہیں ہے آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے۔ تمہیں اپنی گرم چادر بوجھل معلوم ہوتی ہے تو اسے اپنی ضرورت اور اندازے کے مطابق کاٹ لو اور اس کے تاگے کھینچ کر جھالر بنا لو چھوٹا ٹکڑا کسی اور کے کام آجائے گا۔ اس سے تمہاری بوجھل چادر کی شکایت بھی رفع ہو جائے گی اور ضرورت اور موسم کے مطابق کپڑا بھی بن جائے گا۔ یہاں بارک کے علاقے میں وضو کے بعد سردیوں میں پاؤں کو ویزلین ضرور لگانی چاہیئے ورنہ سردیانی سے ایڑیوں کی کھال پھٹنے کا خطرہ ہوتا ہے۔

ہاں یہ بات کبھی نہ بھولنا کہ انسانی زندگی میں سب سے قیمتی چیز ایمان اور خودداری ہے اور یہ دونوں چیزیں لازم وملزوم ہیں جس میں اپنی عزت کی غیرت نہ ہو اس میں ایمان کی رمق نہیں ہوتی چاہے وہ سینکڑوں سجدے کیا کرے ناحق بات کو سننا اور پھر اسے گوارا کرنا حدیث نبوی کے مطابق ایمان کے منافی ہے اللہ کا شکر ہے کہ تم میں یہ خوبی موجود ہے کہ تم ناحق کی روادار نہیں ہو اور اس کی مخالفت کرنے میں تم بے باک بھی ہو چاہے وہ ناحق کہیں بھی پایا جائے اپنوں میں یا بیگانوں میں۔ تم اس بات کو لازماً پسند کرتی ہو جسے اللہ اور اس کا رسول پسند کرتے ہوں میری پسند بھی اس کے بعد اور اس کے مطابق ہی قبول کی جا سکتی ہے۔

سیالکوٹ - ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۷ء

۶۸

مکتوب سالگرہ نمبر

تم پر اللہ کی ہزار سلامتی اور رحمت ہو وہ اللہ جو ساری دنیا کو پالنے والا اور اس کی نگہبانی کرنے والا ہے۔ جس نے روزِ ازل سے ہمیں ایک پاکیزہ رشتے میں جوڑنے کے لیے منتخب کیا اور جس کی رحمت و کرم پر بھروسہ کر کے اپنی تمام آرزوؤں تمناؤں اور کوششوں کی باگ ڈور ہم اس کے ہاتھ میں دیتے ہیں۔ ہم اسی سے اس کی راہ میں استقامت کی دعا کرتے ہیں اور اسی سے ایمان و راستی کی راہ پر چلتے رہنے کی توفیق مانگتے ہیں۔ اسی کا دروازہ ہماری دعاؤں کا مرکز ہے اور اسی کی رحمت ہماری ساری کوششوں کا ماحصل و مقصود ہے۔ ہماری دعا ہے کہ وہ ہمیں عزت۔ خدا ترسی اور ایمان دے اور اپنے دین کا سیدھا راستہ دکھائے کہ یہی نعمتیں سب سے بڑی ہیں اور ہمیں ان لوگوں میں سے نہ کرے جو اس کے نزدیک مغضوب اور ظالمین ہیں بلکہ ان میں سے کرے جن پر اس نے اپنی سیدھی راہ واضح کی اور ان پر اپنی بے بہا نعمتوں کی بارش کی۔

میں یہ خط تمہیں کئی ہفتے کی تاخیر کے بعد لکھ رہا ہوں۔ اس دوران میں ستم ہائے روزگار کا نشانہ رہا ہوں۔ البتہ تمہارا خیال بار بار آتا رہا ہے اور ہر جگہ میرے ساتھ ساتھ رہا ہے بس مجھے اتنا اطمینان ہے کہ تم اباجی کے پاس ہو اور اپنوں کے درمیان آدمی اطمینان سے رہ سکتا ہے۔ خط کی اتنی تاخیر کے لیے معذرت خواہ ہوں لیکن حالات کی

نیرنگی مجھے فٹ بال کی طرح یہاں سے وہاں دھکیلتی رہی ہے - کئی جگہ کے چکر لگا آیا ہوں۔ اس وقت بہت دنوں سے حافظ آباد میں ہوں اور یہیں جم جانے کی کوشش کر رہا ہوں -

آج ہماری شادی کی دوسری سالگرہ ہے - اس لیے اس مہاجرت اور پردیس میں کوئی ہدیہ دینے کی بجائے تمہیں خط لکھنے کا شوق رکھنے کی وجہ سے یہ خط ہی سالگرہ نمبر کے طور پر لکھ رہا ہوں -

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ پچھلے سال کی طرح اس دفعہ بھی آج کے دن میں تم سے دوری اور فراق کی لذت سے دوچار ہوں ۔ اس سال شادی کی دوسری سالگرہ پر پھر میرے پاس قلم کی گونگی زبان ہے جس کی مدد سے میں اپنے اطمینان و مسرت کی بے پایانی سے تمہیں ذرا سا آشنا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں یہ کاغذ کا مختصر سا سینہ میرے دل کے غیر محدود جذبات کو اپنے کاغذی سینے میں سنبھالنے اور سمیٹنے سے قاصر ہے - وقت کا یہ مختصر سا وقفہ ہے جس میں تم سے مخاطب ہوں اور گزری ہوئی روداد زندگی پر غور کر رہا ہوں - آج ہی کے دن ہماری قسمتوں کو وابستگی کے دامن میں یکجا کیا گیا تھا پھر جن مجبوریوں کے حوالے مجھے پچھلے سال نے کیا تھا تقریباً انہیں مجبوریوں کے سایہ سال بھی میرے پاس آیا ہے چونکہ یہ سال ہماری شادی کی تاریخ سے وجود میں آیا ہے اس لیے ان طوفانی حادثات کے باوجود میں اسے بُرا کہنے کی خواہش نہیں رکھتا اور نہ ہی میں اس کے لطف و کرم سے انکار کرتا ہوں البتہ مجھے اس سے صرف اتنی شکایت ہے کہ یہ میری آنکھوں اور ہونٹوں سے مسرت کے اظہار کو چھین کر بار بار میرے قلم کی کند زبان کو دے دیتا ہے - بہر حال میں پھر بھی اس کا خیر مقدم ہی کرتا ہوں اور اسے اپنے خلوص اور محبت کا بہترین ہدیہ پیش

کرتا ہوں۔

آج ہی کی تاریخ تھی جب ہمیں اجنبیت کی بے خبری ہیں سے نکال کر یگانگت اپنائیت کی باخبری کے روشن ہالے میں یکجا کیا گیا تھا جسے لوگ 'شادی' کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ آج ہی کا دن تھا جب ہمیں ہمیشگی کی رفاقت عطا کی گئی تھی۔ آج ہی کا دن تاثیرِ دعا کا مظہر دِن تھا۔ آج ہی کے دِن بقولِ غالب مہر و ماہ و مشتری نے مجھ پہ رشک کیا تھا۔ آج ہی کا دِن تھا جب زندگی نے ہجوم کر کے میرے سر پہ ذمہ داریوں کا بوجھل سہرا باندھا تھا اور آج ہی کے دن فرشتوں نے میری ہمنوائی کی تھی۔ انسان کا دل اس سے بہت سی باتیں چپکے چپکے کہتا رہتا ہے۔ میں نے بھی اس کی بہت سی باتیں سنی تھیں زندگی میں احساسِ خلاء، احساسِ رفاقت، احساسِ تنہائی اور ایسے ہی احساسات کا ایک گونگا بہرا سلسلہ' ایک ہیولا سا ہوتا ہے جو دل و دماغ میں منڈلاتا رہتا ہے۔ کوئی احساس چپکے چپکے بے نام خیالات کی سیڑھی لگا کر دل کی گہرائیوں میں اترتا ہے اور اس خاموش اترنے والے کو انسان پہچاننے کی کوشش کرتا ہے اور بعض اوقات پہچان بھی لیتا ہے۔ لیکن وہ اپنی اس پہچان پہ راز کا پردہ ڈالے رہتا ہے بلکہ اس کے متعلق زور سے سانس لیتا ہوا بھی خوف کھاتا ہے۔ یوں انسان اپنے دل کے چور کو خود ہی پناہ مہیا کرتا ہے۔ اسے اس بات کا احساس بھی لرزا دیتا ہے کہ کوئی اس کی موجودگی جان لے، ان حالات میں انسان سارے اسباب سے بے نیاز ہو کر صرف اس ایک ہی مسبب الاسباب کی بارگاہ پر نگاہ رکھتا ہے۔ انسان کے باہر جو دنیا آباد ہے اس سے بہت بڑی دنیا خود اس کے اپنے اندر آباد ہوتی ہے جس کی آبادی باہر کی دنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔

اور پھر ایک دن آیا مئی کی ۲۹ تاریخ تھی اور سن ۱۹۴۵ء تھا جو میری ایک پرانی اور چھوٹی سی نوٹ بک میں اب تک درج ہے جب بھائی جان اور ابا جان کی ملاقات میں وہ بات طے ہوئی اور مجھے بذریعہ خط اطلاع دی گئی تھی کہ اندرونی اثرات نے بیرونی دنیا میں یہ فیصلہ کرایا تھا جس فیصلے سے ہم تم آگاہ ہیں چنانچہ چھ ماہ کے اندر اندر ضابطے کی تمام کارروائیاں مکمل ہو گئیں تھیں ضابطے کی آخری کارروائی کیلئے آج کا ہی دن مقرر ہوا تھا اس طرح یہ دن ہماری زندگی میں یادگار دن بن گیا ہے یوں گویا آسمان کی ایک مرضی زمین پر پوری ہو گئی تھی۔

پھر مجھے وہ شام یاد آتی ہے جب ہم دونوں کو سواری میں بٹھا کر فیل گنج کے بارہویں کوچے سے گیارہویں کوچے میں چچا جان مظہر کے مکان تک لایا گیا تھا ان دنوں اس مکان میں کوئی شاہ صاحب رہتے تھے یوں ہمارا قافلۂ بہار تھوڑے سے فاصلے تک آغازِ سفر کی ریہرسل کے طور پر روانہ ہوا تھا۔ پھر مجھے یاد آتا ہے کہ اسی رات عشاء کی نماز پڑھتے ہوئے ابا جان نے کہا تھا کہ اب تمہیں پوری نماز پڑھنی چاہیئے اس لیے کہ سسرال کے شہر میں نمازِ قصر نہیں ہوتی گویا تم نے میری زندگی میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے مجھے اس شرعی رعایت سے محروم کر کے اپنے وجود کا احساس دلایا تھا جو رعایت مجھے مسافر ہونے کی حیثیت سے تمہارے شہر میں حاصل ہوا کرتی تھی گویا اب اس شہر میں میں مسافر نہیں رہ گیا تھا وہ شہر اب میرا اپنا گھر بن گیا تھا گویا اس کے گلی کوچے میرے اپنے گلی کوچے تھے میں اس شہر میں اب اجنبی نہ رہا تھا ایک خوشگوار انقلابِ زندگی نے مجھے مسافر سے بدل کر مقامی بنا دیا تھا۔

اس تقریبِ سعید کے بعد پھر مجھے دہلی واپس جانا یاد آتا ہے۔ گویا دہلی سے

میں تنہا آیا تھا اور اب تنہا واپس جانے کے باوجود میں تنہا نہیں رہ گیا تھا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ کس کس طرح خورشید صاحب ممتاز صاحب کوثر صاحب اقبال صاحب اور دوسرے بے تکلف احباب نے مجھ سے بار بار مٹھائی کھائی تھی دعوتیں وصول کی تھیں مجھے یاد ہے کہ نیرنگِ خیال کے ایڈیٹر میرے دیرینہ دوست حکیم یوسف حسن نے جوان دنوں دہلی آئے ہوئے تھے کس طرح مجھ سے مٹھائی کی خصوصی دعوت وصول کی تھی اور اتنی مٹھائی منگوائی تھی کہ وہ باقی ماندہ اپنے ساتھ لاہور بھی لے گئے تھے۔

پھر امی جان سے خط و کتابت کی خصوصی اجازت حاصل کی گئی اور میرے چند خطوط جانے کے بعد تمہارے خطوط بھی آنے لگے تھے چھوٹے چھوٹے فقروں والے دل خوش کن خطوط گویا جنت کی ندیاں تھے جن میں میں تیرا کرتا تھا۔

جانِ من۔ وہ آج ہی کا دن تھا جب قدرت نے اپنی عطا اور بخشش کے سارے خزانے ہم پر انڈیل دیے تھے ۲۳ نومبر کی شام کو شاید موسم بہار زوروں پر تھا اس سال تو موسم سرما میں ہی بہار بہت گھر آئی تھی، بہت جم کر پھیلی تھی اور بہت پھول کر ہر طرف چھاگئی تھی۔ میرے باغِ آرزو میں کھلنے والا پھول تو سب پھولوں میں سب سے بڑا پھول تھا۔ کون نہیں کہے گا کہ پھول مسرت کی موزوں ترین علامت ہے اس لیے کہ پیدائشی طور پر ہی اس کے بے شمار ہونٹ مسرت سے کھلے ہوئے ہوتے ہیں۔

آج ۲۳ نومبر ہے اور گزشتہ ۲۳ نومبر کے درمیان کا پورا دور میری نگاہوں میں پھر رہا ہے۔ شادی کی ابتدائی مدہوشی کا ایک سال آج مکمل ہو گیا ہے۔ پچھلے ۲۳ نومبر سے اب تک ہم مختلف حالتوں میں رہے ہیں یہ پورا دور میری نگاہوں میں کسی روشن اسکرین کی طرح پھر رہا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق ۲۳ نومبر

۱۹۴۶ء سے ۲۳ نومبر ۴۷ء کے اس درمیانی وقفے میں ہم تقریباً دو سو سات دن یکجا رہے ہیں اور ایک سو اٹھاون دن جدا۔ یہ یکجائی اور جدائی ہمارے اس سال کے ازدواجی سمندر میں گویا دو جزیرے ہیں۔ ان میں ایک شاداب و فرحاں ہے اور دوسرا خشک و حرماں نصیب۔ ایک پر ہم نے محبت و اعتماد کی بہترین سرگوشیاں کی ہیں اور دوسرے پر ہم نے جدائی کی آہیں بھری ہیں۔ ایک پر رفاقت کی پینگیں بڑھائی ہیں اور دوسرے پر فرقت کی کروٹیں بدلی ہیں۔ ایک میں ہم یوں تھے جیسے جنتِ عدن کے بے فکرے مسافر اور دوسرے میں ایسے تھے جیسے جنتِ عدن سے نکالے ہوئے دو جلاوطن مہاجر، جن میں سے ایک جدّہ میں پڑا ہو اور دوسرا لنکا پر پُل تعمیر کر رہا ہو۔ ایک وقفہ ہمیں اپنی یاد سے مسرت کی لوریاں سناتا ہے اور دوسرا اپنی یاد میں فراق کی تلخیاں رکھتا ہے۔ یہ دونوں زمانے ہمارے اس سال کے روشن و تاریک پہلو بنے ہوئے نظر آتے ہیں اور دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر بہت ضروری ہیں تاکہ ایک دوسرے کی اہمیت کو ہم پر واضح کر سکیں۔

ان دو سو سات دنوں میں وکوہے کی راتیں بھی ہیں دہلی کے روشن و چمکدار دن بھی ہیں اور کیمپ کی صبر آزما گھڑیاں بھی ہیں اور ان میں لدھیانے کے وہ چند دن بھی ہیں جب گویا سارے گھر میں ہماری ہی حکومت تھی اور اس در و دیوار میں ہم ہی ہم تھے جب امی ہسپتال میں تھیں۔ پھر فرقت کے ایک سو اٹھاون دنوں میں دلی میں مکان نہ ملنے کے سوگوار دن بھی ہیں، میری دہلی کو واپسی کے دن بھی ہیں پھلور میں مکان نہ ملنے کے دن بھی ہیں اور یہ دن بھی ہیں جب تم سرگودھے کے قید خانے میں نظر بند ہوا اور میں حافظ آباد اور لائل پور کے درمیان سفر کا جالا بُن رہا ہوں۔ بہر حال اس سارے سال کے خزانۂ وقت میں سے ہم نے دو سو سات دنوں کا "اپنا حصہ" وصول کیا ہے اور چونکہ وہ دن ہماری

رفاقت کے دن ہیں اس لیے وہ روشن و تابناک بن جاتے ہیں وہ دہلی میں تمہاری بیماری اور ہسپتال کے دن ہوں یا چھت کی سیڑھی سے گرنے کے سبب میرے سخت چوٹ کے دن ہوں یا کیمپ کے ہولناک دن ہوں جہاں ہر وقت جان کا خطرہ سامنے تھا۔ بہر حال احساس رفاقت سے مصیبتوں کے پہاڑ اپنے سارے خوفناک بوجھ کے باوجود ہلکے ہو جاتے ہیں۔ پھر انسان ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کو ہر وقت تیار رہتا ہے۔ پھر وہ کیمپوں کے اندر برستی ہوئی گولیوں اور دشمنوں کی طرف سے حملے کے بدترین خطروں میں بھی اطمینان سے ہنس سکتا ہے مسکرا سکتا ہے اور بے فکری کی نیند سو سکتا ہے۔

۹، نومبر ۴۶ء سے ۲۴، دسمبر ۴۶ء کا ایک وقفہ ان ایک سو اٹھاون دنوں میں سے ایک وقفۂ فرقت ہے یہ وہ دن تھے جب میں دہلی میں پڑا ہوا تھا اور طاغوت سے چھٹکارا پانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور تم لدھیانہ میں ضبط کا بند باندھے بیٹھی تھیں میں تمہاری خیریت کا اور تم میری خیریت کا انتظار کیا کرتی تھیں ان دنوں میں تمہیں دہلی میں لانے کے لیے مکان تلاش کیا کرتا اور تم اس تلاش کے نتیجے کے انتظار میں دن گنا کرتی تھیں۔ پھر میں نے مکان ڈھونڈ لیا اور اپنے وعدے کے مطابق ۲۴ دسمبر کو لدھیانہ پہنچ گیا۔ تم نے مجھے ان دنوں تشویش بھرے خطوط لکھے تھے۔ تمہیں زندگی کے بعض نئے تجربات سے سابقہ پیش آ رہا تھا۔ تم بہت سٹپٹا رہی تھیں اور میں بھی پریشان سا تھا۔ ۲۴، دسمبر کو جب میں لدھیانہ پہنچا تو تم نے اسی دن بیماری کی پہل کی۔ بات معمولی سی سمجھ کر نظر انداز کر دی گئی اور تم بھائی جان کے پاس دکوہے چلے آئے پھر جب ہم دہلی کے لیے تیار ہوئے تو پناہ بخدا بارش دم نہ لیتی تھی۔ ۲۴، دسمبر سے ہمارا دو سو سات دن کا وقفۂ رفاقت شروع ہو چکا تھا۔ بھائی جان اپنی محبت اور بزرگی سے مجبور اپنی کمزور اور چھوٹی سی جان کے ساتھ ہمیں اسٹیشن

تک چھوڑنے آئے تھے۔ سردی اور پانی کے گڑھوں میں سے ہم اچھلتے پھاندتے اسٹیشن تک پہنچے تھے۔ گاڑی میں تمہیں بھی اچھی جگہ مل گئی اور مجھے بھی۔ بھیگے ہوئے کپڑوں اور گرم دلوں کے ساتھ ہمارا سفر شروع ہوا تھا۔ بھائی جان کس مصیبت سے سردی میں ٹھٹھرتے اور بارش میں بھیگتے گھر واپس پہنچے ہوں گے یہ وہی جانتے ہوں گے۔ میرے دل میں ان کی اس پریشانی کا بہت احساس تھا۔ انہیں ہم سے کتنی بے پناہ محبت تھی۔

لدھیانہ اسٹیشن سے وہ بوڑھی خاتون تمہارے ڈبے میں بیٹھی تھی جسے ہمارے ساتھ دہلی تک جانا تھا۔ یہ عبدالسلام کوثر کی والدہ تھی۔ تم نے لدھیانہ سے آگے یہ پہلا سفر کیا تھا اور میں تمہارے ساتھ یہ پہلا سفر کر رہا تھا۔ پھر ہم محلہ گھوسیاں میں پہنچ گئے تھے۔ گوبر بھینس گانوں کے ریکارڈ اور نانی اماں اس محلہ کی خاص چیزیں تھیں۔ دل کا نہ لگنا کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ چونکہ ہم دونوں جو موجود اور اکٹھے تھے پھر تو ممتاز صاحب کی بچی زینب بھی تمہارے لیے تنہائی کی رونق بن گئی تھی۔ عبدالسلام کوثر کی اہلیہ ان کی بچی اور ان کی بوڑھی ماں یہ سب تمہارے لیے ہر وقت کے پر رونق رفیق تھے۔ ان دنوں ہماری چھوٹی چھوٹی ناراضگیاں بھی ہوتی تھیں اور غصہ تھوک دینے کے بعد ملاپ کی طویل حکایتیں بھی تھیں اب بھی تمہیں شاید اس سردی کا احساس ہو جو دہلی کی صبح میں ہوتی تھی ٹھنڈے پانی سے وضو اور پھر قریب کی مسجد میں نمازوں کیلئے مارا مارا جانا۔ پھر وہاں کا پٹھان مؤذن جو سورج نکلنے سے صرف چند منٹ ہی پہلے اذان دیا کرتا تھا۔

تمہارے آنے سے پہلے میں نے اپنی بے تدبیریوں اور شاہ خرچیوں سے اخراجات کو بہت بے ڈھب بنا رکھا تھا اور ان کا بے ڈھب پن خود تمہیں آ کر بھگتنا پڑا تھا۔

تم نے اگر سارا وقت قرض اتارنے میں ہی صرف کیا تھا لیکن پھر بھی ہم بہت خوش تھے اور زندگی کا ہر لمحہ ہم پر رشک کیا کرتا تھا۔ لدھیانہ سے اپنے ہمراہ لائی ہوئی تمہاری بیماری تمہارا ساتھ دیئے جا رہی تھی اور میں روز دفتر سے آکر پہلی بات عموماً یہی پوچھا کرتا تھا کہ آج کا دن کیسا گزرا؟ جواب عموماً ایک ہی ہوتا تھا۔ ذرا تسلی بخش ہوا تو مطمئن ہو گیا تسلی بخش نہ ہوا تو اٹھ کر حکیم صاحب کے پاس چل دیئے یا اباجان کو آج خط لکھنے بیٹھ گئے۔

مکان کی دوسری منزل پر رہنے کی جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں مصیبتیں بھی بہت ہیں چنانچہ ایک روز میں سیڑھی سے گر پڑا، گر کر تیمور لنگ بن گیا مجھے وہ دن آج بھی یاد ہیں جب میں سارا دن لیٹا رہتا اور ذرا ہلتا جلتا تو درد سے کراہ اٹھتا۔ تم نے ٹانگ پر مالشیں کیں گرم روئی سے سینکا، دوائیاں لگائیں، تیمارداری کی، اور پندرہ دن بعد جب میں اٹھ کر چلنے لگا تو تم کچھ زیادہ ہی بیمار ہو گئیں۔

آج سے والد صاحب تشریف لائے، نسخے بنا کر دیئے اور چلے گئے اگرچہ ان کے نسخوں سے تمہیں کچھ افاقہ بھی ہوا لیکن بیماری دب کر پھر اچانک بڑھ گئی مجھے وہ رات نہ بھولے گی جب تم نے کراہتے کراہتے ساری رات بسر کی صبح ہوتے ہی ہم ہمدرد دواخانے گئے، لیکن ہمدرد میں اشتہار بہت ہے شفا کم ہے۔ بیماری بہت بڑھ گئی تمہیں کمزوری کے پسینے آنے لگے اور تم بالکل ہی نڈھال ہو گئیں۔ وہ دن مجھے اب تک یاد ہے جب میں نے تمہیں اوپر کی منزل سے سہارا دے کر سیڑھیوں سے نیچے اتارا اور تم نانی اماں کے صحن میں بچھی ہوئی چارپائی پر لیٹ گئیں مجھ پر سخت گھبراہٹ طاری تھی لیکن مجھے خطرہ تھا کہ تم میری یوں گھبراہٹ دیکھ کر زیادہ گھبرا نہ جاؤ تمہاری بے چینی اور آنکھوں کی حسرتناک کمزوری ناقابل بیان تھی۔ آخر ہم تانگے میں لیڈی ہارڈنگ ہسپتال پہنچے اور تم پہیے والی

کرسی پر اندر لے جائی گیئں ۔میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار نہایت لجاجت اور نرمی سے ڈیوٹی نرس سے خصوصی توجہ کی درخواست کی تھی ۔ دوسرے دن تم نے شام کو مجھے اطلاع دی کہ بیماری سے جان چھوٹ گئی اور اب تم بہتر ہو صرف کمزوری باقی ہے میں نے کہا تھا کہ خس کم جہاں پاک ۔ ان دنوں میں دفتر سے جلد جلد اور بھاگم بھاگ آیا کرتا تھا ۔نالائق نرسیں تمہیں انجکشن لگا لگا کر روز بخار چڑھا دیا کرتی تھیں اور ہم ان کی اس حرکت پر سخت چڑا کرتے ۔

گھر میرے لیے تنہائی اور پریشانی کا مقام تھا پھر وہ مسرت بھرا دن بھی آیا جب تم تندرست ہو کر واپس آئیں تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے کمرے کو کس قدر صاف کر رکھا تھا ہسپتال سے واپس آکر تمہیں امی کی یاد ستانے لگی ۔ بہر حال تمہاری یہ بات کچھ غیر فطری بھی نہ تھی ۔ تم نے پنجاب جانے کا مبہم اور دبا ہوا سا اظہار کیا تھا میں جانتا تھا کہ تم زور کسی صورت بھی نہ دوگی اور خواہ مخواہ اپنے دل پر جبر کرو گی ۔ انہی دنوں تحریک اسلامی کا سالانہ اجلاس آگیا جو دارالاسلام پٹھانکوٹ کے مقام پر منعقد ہو رہا تھا اس طرح دونوں باتیں ساتھ ساتھ آئیں اور ہم بھائی جان کے پاس دکوہا پہنچ گئے ۔ اجلاس سے واپسی پر ۱۲ مئی کو تم لدھیانہ پہنچ گئیں اور ۱۸ مئی کو میں دہلی چلا گیا اس طرح دوسو سات دنوں کی خوشگوار رفاقت میں سے ایک طویل ترین اور خوشگوار ترین وقفہ یوں ختم ہوا ۔

پھر ایک سو اٹھاون دنوں کے ایام فرقت کا آغاز ہوا ۔ میں طاغوت سے چھٹکارا پانے کی خاطر بھلوریں میں جنرل اسٹور کھولنے کا فیصلہ کر کے دہلی میں سامان خرید رہا تھا اور تم مجھے پنجاب کی طرف جلد از جلد بلا رہی تھیں ۸ جون کو میں بھائی جان کے پاس

دکوہا پہنچ گیا اور ۱۲؍ جون کو پورے ایک ماہ کے بعد پھر تم سے لدھیانہ میں آملا یہ ایام طاغوت کی ملازمت سے چھٹکارا پانے کی خاطر تجارت کے لیے میری ابتدائی تیاری کے دن تھے ان دنوں میں پھلور میں مکان تلاش کر رہا تھا۔ تم بھی آنے کے لیے منتظر تھیں یہاں تک کہ وہ وقفہ آیا جو دو سو سات دنوں میں سے ۱۲؍ دن کا دوسرا وقفۂ رفاقت تھا۔ امی لدھیانہ میں مشن ہسپتال میں تھیں اور ہم گھر پہ تھے۔ جانو گھر میں کام کاج کرتی تھی امی کے ساتھ بھی تمہارے جیسا حادثہ پیش آیا تھا چنانچہ امی کی ہسپتال سے واپسی کے بعد میں واپس پھلور چلا آیا۔ ۱۶؍ جولائی کو میں نے دکان کھول لی اس وقت فسادات کی ابتدا ہو چکی تھی۔ پیہم کوششوں کے باوجود پھلور میں مکان نہ ملا تو میں تمہیں اگست کی ابتدائی تاریخوں میں بھائی جان کے مکان پر دکوہا لے آیا۔ اس طرح رفاقت و فرقت کے دن ملے جلے گزر رہے تھے۔ میری ساری کوششیں پھلور میں مکان کے حصول پر مرکوز تھیں آخر مکان ہاتھ آیا تو تب آیا جب فسادات کی آگ سارے انسانی جنگل میں لگ چکی تھی اور عید کے بعد ہم پھلور جا کر اس مکان میں محصور ہو گئے جو متحدہ ہندوستان میں ہماری آخری قیام گاہ تھا۔

کیمپ کی زندگی کی ابتدا اسی وقت اسی مکان سے ہو گئی تھی پہرے اور خطرے کا دور تھا لیکن ہم اطمینان سے سویا کرتے تھے ہمیں کوئی پریشانی نہ تھی بالآخر امی جان بھی پریشان ہو کر لدھیانہ سے پھلور آ گئیں پھر وہ اپنے گاؤں مائی جی کے پاس جھنگیاں چلی گئیں وہ تھہرا اور گاؤں آتی جاتی رہیں اور آخر ۳۱ اگست کو تیار ہو کر یکم ستمبر کو ہم سب کیمپ میں آ گئے۔ یہ دو سو سات دنوں کے وقفۂ رفاقت کا آخری حصہ تھا جو تکلیف پریشانی اور مصیبت کے ساتھ آیا تھا لیکن ہمارے لیے یکجائی میں یہ سب کچھ بہت ہی سہل تھا۔

تمہیں البتہ بہت پریشانیاں تھیں کام کی کثرت تھی کھانے پینے پہننے سونے غرض ہر طرح کی دقت تھی چاروں طرف فساد کی آگ بھڑک اٹھی تھی اور ہم ان شعلوں میں گھرے ہوئے اور بارش میں بھیگے ہوئے کھلے کھیتوں میں بیٹھے تھے ۔ زمین پر سونا پڑتا گیلی زمین اور کیچڑ میں رات گزارنی پڑتی' بارش کا زور حملے کا خطرہ ' پاکستان آنے کی طرف سے مایوسی اور گھبراہٹ البتہ کیمپ میں لوگوں کی خدمت کرنے سے ذرا سکون ہوتا ' ان دنوں تم نے جس ہمت ضبط حوصلے بہادری اور چستی کا ثبوت دیا وہ ہمیشہ یادگار رہے گا ۔ تم سے مجھے ایسی ہی امید تھی جس کے ساتھ چین کے دن گزارے ہوں اس کے ساتھ تکلیف کے دن گزارنے میں بھی ایک عجیب لذت ہوتی ہے ۔ ان ایام کی سختی کو بھی تم نے تحمل بردباری اور محبت کے جذبے سے گزارا ان دنوں پیاس بھوک اور تکلیف کی برداشت بھی میں نے تم میں بہت دیکھی ۔ ان فسادات نے تمہارے ان جوہروں کو مجھ پر بہت واضح کیا جو شاید عام حالات میں تمہاری خاموشی اور تحمل کے نیچے دبے ہوئے ہیں کبھی نہ دیکھ سکتا ۔ لاہور کا پلیٹ فارم تھا اور تم پھر بیمار تھیں ۔ تمہاری بیماری تکلیف اور درد اور پھر تمہارا یہ اصرار کہ تم داداجی کے پاس لاہور میں ان کے اصرار کے باوجود نہیں ٹھہرو گی بلکہ میرے ساتھ ہی لائل پور جاؤ گی تمہارے اس انداز نے مجھے بتایا کہ تم آرام و راحت کی ہی نہیں بلکہ دکھ اور درد کی بھی ساتھی ہو اور مصیبت میں بھی تمہارا قدم میرے ساتھ ہی اٹھے گا ۔ ضبط کے ساتھ تم نے اپنی بیماری کو دبایا اور ہم لائل پور چلے گئے اور پھر وہاں سے سرگودھے والدین کے پاس پہنچ گئے پھر غم واندوہ کے بھاری اور بوجھل جذبات کے ساتھ میں تم سے رخصت ہوا اور یوں دو سو سات دنوں کا وقفہ رفاقت ہماری شادی کی اس سالگرہ میں سے مکمل ہو گیا ۔

اس کے بعد وقفۂ فرقت شروع ہوا جس کی ابتداء یکم اکتوبر کی صبح سے ہوئی اور وہ یکم اکتوبر سے لے کر آج کے دن تک چلا آتا ہے یہ ہماری سالگرہ کا آخری ٹکڑا ہے دوری اور فرقت۔ گویا انتظار کے دن ابھی باقی ہیں۔

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذتِ طلب

چونکہ لذتِ طلب قائم ہے اس لیے اس اعتبار سے ہمارا یہ سال باہمی پیش قدمی کیلئے چشم براہ ہے گویا ہمارا اندرونی سفر ابھی باقی اور جاری ہے۔

سرگودہا میں تم سے رخصت ہو کر میں نے ذہنی اور قلبی کشمکش کے درمیان سفر کا آغاز کیا۔ شورکوٹ میں تم نہ معلوم کیوں بہت یاد آئیں، واپسی تک کا ارادہ ہو گیا لیکن چونکہ عملی دنیا جذبات اور احساسات کی دنیا سے بہت مختلف ہے اس لیے میں نے واپسی کا ارادہ ترک کر دیا۔ ہمیں تو آگے ہی آگے جانا ہے، عباس پور کے شور و شغب نے مجھے تنہائی کی اداسی سے بہت کچھ بچائے رکھا۔ عید پر تو میں نے سرگودہا آنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا لیکن ایک دن قبل بھائی جان کے مشرقی پنجاب سے آجانے کی وجہ سے پروگرام ملتوی ہو گیا۔ عید کے بعد ہم دونوں بھائی یہاں حافظ آباد آگئے اور پھر وہ سیالکوٹ چلے گئے اور اب تک میں اس انتظار میں ہوں کہ معاملات سیدھے ہوں تو تمہیں لانے کے لیے سرگودہا آؤں لیکن کب آؤں یہ بات ابھی غور طلب ہے اس طرح آج کے دن پچھلے سال کا وقفۂ فرقت ختم ہوتا ہے اور نیا سال اسی وقفۂ فرقت کے ساتھ از سرِ نو کل سے شروع ہوتا ہے۔

یہ گزشتہ سال کی مختصر واقعاتی روداد ہے جس کی حیثیت محض شخصی اور داخلی ہے

اور اس کا تعلق صرف ہم دونوں کی ذات سے ہے یہاں ہر وہ بات جو ہم دونوں کے دائرے سے خارج ہے نظر انداز کر دی گئی ہے اب میں اسی گزرے ہوئے سال پر انسانی تعلقات سیاسی انقلابات قومی اختلافات اور اخلاقی بحران کے نقطہ نظر سے نگاہ ڈالتا ہوں تو منظر اور بھی زیادہ ہیبت ناک نظر آتا ہے اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس سال میں انسان نے قومیت پرستی سے جتنا دکھ اٹھایا ہے اور اس ظالم قوم پرستی نے جس طرح انسانیت کو ذبح کیا ہے اس کی مثال شاید تاریخ میں ڈھونڈنے سے بھی نہ مل سکے گی۔

قوم پرستی کے پیدا کردہ ہندو مسلم فسادات تب بھی تھے جب ہم دہلی میں تھے اس وقت بھی رہے جب ہم وہاں سے چلے آئے۔ لیکن اُس وقت ان فسادات کی نوعیت ہمارے ذہن میں بس اتنی ہی تھی کہ چند فرقہ وارانہ تعصبات اور نار انسگیوں کی بنا پر چند جانوں کا خون ہو جائے گا۔ چند دنوں تک ہنگامہ برپا رہے گا۔ کچھ دن اخبارات شور مچائیں گے اور بالآخر دو طرفہ سکون ہو جائے گا۔ اس لیے کہ پچھلے کئی برسوں سے ہندوستان ہمیشہ ایسے ہی فسادات کا عادی چلا آرہا ہے دنیا کو فسادات کی اس نوعیت کا تجربہ پہلے نہ تھا کہ ایک قوم دوسری قوم کو کلیتہً مٹا دینے تک کے سارے ذرائع استعمال کرے گی جنہیں اخلاق و انسانیت تو کیا خود حیوانیت بھی دیکھ کر شرمائے گی۔ کسی ایک مذہب والوں کی وسیع آبادیوں پر کسی دوسرے مذہب والوں کے مسلح جتھوں کا چڑھ آنا اور اندھا دھند مار پیٹ، زدوکوب، ہلاکت و تباہی، آتش و بربادی، بہیمت و خونخواری اور ذلت و پستی و درندگی جیسے افعال سر انجام دینا افراد کی انفرادی حیثیت سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا فرداً فرداً اپنی اپنی جگہ پر ہر شخص اسے بُرا سمجھتا تھا لیکن مجموعی حیثیت سے۔ سب لوگ وہی کچھ کر رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ درندوں کو شراب پلا کر انسانوں

کی بستیوں میں چھوڑ دیا گیا تھا جب کہ انفرادی طور پر نہ حملہ آور کو مظلوم سے کوئی ذاتی بغض تھا اور نہ ہی وہ اس سے واقف تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ زہر جو مختلف جماعتیں اور ان کی قیادتیں قومیت پرستی کے نام سے اپنے اپنے گروہوں میں پیدا کر رہی تھیں وہ زہر اچانک رنگ لے آیا تھا اور جب اس زہر والے لوگوں کو احساس ہوا کہ ان کے اس زہر کو قوم کی اشیرباد بھی حاصل تھی تو پھر اس زہر نے خوب کھل کھیلا۔ غیر مسلم لیڈروں نے غیر مسلموں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکا رکھا تھا اور مسلمان لیڈروں نے مسلمانوں کو ان کے خلاف قومیت کی شراب پلا رکھی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ ناواقف، انجان اور بے لگام عوام بھڑکے ہوئے حیوانی جذبات کے ساتھ اپنی اجتماعی غیر ذمہ داری کا ثبوت دینے لگے اور جب ان کے رہنماؤں کی طرف سے بھی انہیں شہ مل گئی پھر تو گویا ان کے لیے بے انتہا درندگی کے لیے قومی سند فراہم ہو گئی اور ان کے لیے حیوانیت کے لاتعداد دروازے کھل گئے۔ نہ مسلمان نے غیر مسلم کو خدا کی مخلوق کی حیثیت سے دیکھا اور نہ غیر مسلم نے مسلمان کو خدا کی مخلوق جانا۔ کسی نے یہ سمجھنے کی کوشش نہ کی کہ قدرت سب انسانوں کو اپنی یکساں نعمتیں دے کر باہمی مساوات اور یکساں سلوک سکھاتی ہے اور اپنے بے غرض بے تعصب بے لوث اور غیر جانبدار رویے سے انہیں یہ سبق دیتی ہے کہ سب انسان بحیثیت بنی نوع انسان برابر اور مساوی ہیں اور انہیں دکھوں تکلیفوں اور دردوں کا احساس یکساں حالات میں یکساں ہی ہوتا ہے۔ نہ غیر مسلم سمجھے کہ جان و مال عزت و آبرو کے نقصان کا دکھ جتنا انہیں ہوتا ہے اتنا ہی مسلمان کو بھی ہوتا ہے اور نہ مسلمان ہی یہ سمجھے کہ ایسے نقصانات کا درد غیر مسلموں کو بھی انہی کی طرح ہوتا ہے اور وہ تو دنیا کو سلامتی کا درس دینے کے لیے بنائے گئے تھے نہ کہ ہلاکت و تباہی کے لیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے دریغ بے دردانہ اور بے مہار ظلم کیے گئے۔ ظلم کا

جواب ظلم اس کا جواب ظلم اور اس کا جواب بھی پھر ظلم اور یوں ظلم کا یہ چکر اتنا بڑھا کہ ہزاروں اور لاکھوں خاندان اجڑ گئے، لاکھوں جانیں ضائع ہو گئیں۔ انسانی زندگی کا جوہر عزتیں برباد ہو گئیں قیمتی جائدادیں اور املاک تباہ ہو گئیں اور انسانوں کے ان دونوں گروہوں نے اپنے اپنے اقتدار کے علاقوں میں ایک دوسرے کو مصیبت اور عذاب سے دوچار کر دیا۔ اس کی بجائے کہ وہ روائتی عقلمند بکریوں کی طرح ایک دوسرے پر سے صلح صفائی کے ساتھ گزر کر اس تباہی کے پل کو پار کر جاتے انہوں نے درندوں کی طرح ایک دوسرے پر حملے کر دیئے نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں مادی اخلاقی جانی اور معاشرتی طور پر اس تباہی کے غار میں گرے جس سے جلد نکل آنا ان کے بس کی بات نہیں ہے اور اس کے دور رس نتائج ابھی وہ آگے چل کر دیکھیں گے جب جائدادیں بٹیں گی جھوٹ رشوت اور حرام خوری کا چکر چلے گا اور دونوں قوموں کے اخلاق تباہ ہو جائیں گے افسوس کہ اس قومی کش مکش میں وہ بھی پٹے جو اس زہر کے حامل اور اس کے پھیلانے والے تھے وہ بھی لٹے جو محض اس سے ہمدردی رکھتے تھے اور وہ بھی تباہ ہوئے جو بیچارے اس سے محض بے تعلق تھے لیکن جب تباہی کا سیلاب آتا ہے تو وہ ہر اونچ نیچ کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔ زہر پھیلانے والے اپنے گناہ کی پاداش میں پٹے۔ سرسری ہمدردی رکھنے والے اپنی نیت کی خرابی کے سبب لٹے اور بے تعلق لوگ اس لیے تباہ ہوئے کہ وہ خدا کی اس سرزمین پر آنکھیں کھول کر کیوں نہیں رہتے تھے اور جلتی آگ کو بجھانے کے کام سے کیوں غافل تھے البتہ جو چند لوگ اکا دکا اپنی جگہ واقعی اس آگ کو بجھانے میں مصروف تھے وہ اپنے اللہ کے ہاں ضرور اجر پائیں گے۔

لیکن اس سے یہ بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ اس دور کی قیادت چاہے وہ

غیر مسلموں کی ہو یا مسلمانوں کی، انسان کو انسان کی حیثیت سے پہچاننے سے قاصر ہے اور انسان کے مسائل کو وہ انسانی نقطۂ نظر سے حل نہیں کر سکتی ہندوستانی قیادت تو ایک بے دین اور سیکولر قیادت ہے اور اس کے پاس بے دینی کے سوا کوئی دوسرا نظریۂ حیات بھی نہیں ہے وہ تو اسی ڈگر پر چلنے پر مجبور ہے اس کے پاس تو یورپ کی ظالم قوم پرستی کا لادینی تصور ہی ہے جس میں کسی دوسری قومیت کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے کافر کا ظلم تو سمجھ میں آنے والی چیز ہے اس لیے کہ کافر تو ہوتا ہی ظالم ہے جو خدا پر ظلم کر سکتا ہے وہ اس کے بندوں پر ظلم کیوں نہ کرے گا۔ لیکن آخر مسلمان کو کیا ہوا ہے جس کے پاس اپنا ایک مکمل نظریۂ حیات موجود ہے جس کی ریاست کلمۂ طیبہ کی مرہونِ منت ہے۔ مسلمان کا مشن تو اس سے بلند تر ہے کہ وہ تنگ قومی دائرے کے اندر کسی ریاست کی تشکیل کرے اس کے پاس تو وہ بنیاد ہے جس پر وہ ساری دنیا کو اپنی پیروی کی دعوت دے سکتا ہے، جب اس طرف نگاہ جاتی ہے تو دل چیخ اٹھتا ہے کہ ہماری قیادت اسلامی نقطۂ نظر سے اصولی طور پر اپنے موقف سے بہت دور ہے۔ کافر قوم کے پاس جو کچھ بہترین ہے وہ اس نے اختیار کیا ہے اور ہمارے پاس جو بہترین ہے اسے نظر انداز کر کے ہم نے بدتر کو اختیار کر لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ قومی تربیت اور اسلامی قیادت کے اس معیار کے لحاظ سے ہم مسلمانوں کی اس نئی ریاست کا مستقبل بھی اسلامی نکتہ نظر سے کچھ زیادہ درخشاں نہیں ہے۔ ہمیں اسے درخشاں کرنے کے لیے بڑی جد و جہد کرنی ہوگی۔ ورنہ اس اخلاق کے ساتھ مجھے تو یہ گاڑی سیدھی تباہی کی طرف جاتی ہوئی نظر آتی ہے۔

مجھے آج کے دن بہت کچھ یاد آ رہا ہے۔ وہ سب کچھ جسے تباہی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اس تباہی نے انسانیت شرافت رفاقت محبت، ہمدردی اخلاق واخوت

ہر چیز کو جلا کر رکھ دیا ہے، مکان ہی نہیں جلے ان کے ساتھ انسانوں کی انسانیت بھی جل گئی ہے آج مجھے وہ مقامات یاد آ رہے ہیں جنہیں ہم پوری واقفیت سے اپنا کہتے اور اپنا سمجھتے تھے۔ وہ پھلور کے گلی کوچے، وہ لدھیانے کے چوڑے بازار اور فیل گنج کے کوچے آج وہاں ایک مسلمان بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ وہ پل سے اتر کر سامنے جانے والا راستہ جو سیدھا فیل گنج کو جاتا تھا۔ وہ پھلور کی جانی بوجھی سڑکیں، وہ چوہدری صاحب کا اسلامی ہوٹل، وہ گیلانی اسٹور اور وہ دیوڑوں کا مکان، وہ پھلور کا جانا پہچانا اسٹیشن، وہ لدھیانے سے پھلور کا چکر، وہ دریائے ستلج کا پل، وہ بھائی جان کا دکوہا اور اس کے گلی کوچے، یہ سب کل ہمارے پاؤں کے نیچے تھے لیکن آج وہاں مسلمان کا نام تک موجود نہیں ہے۔ وہ بلند و بالا مسجدیں جن میں پانچ وقت اذانیں دی جاتی تھیں اب وہ مسلمانوں کے فراق میں اپنے اونچے میناروں والی دونوں بانہیں آسمان کی طرف اٹھا کر تنہائی کی فریاد کر رہی ہیں۔ کل جن مسجدوں میں جوتا تک لے جانا ممکن نہ تھا آج وہاں شرابیں پی جاتی ہیں۔ وہ دہلی کا دارالخلافہ اور اس کا چاندنی چوک جس کی سڑکوں پر میں گھوما کرتا تھا۔ وہ شاہجہاں کی بنائی ہوئی جامع مسجد جس میں حضرت اسمٰعیل شہیدؒ نے اپنی تحریک کے ابتدائی مراحل طے کئے اور جہاد کے ابتدائی پروگرام بنائے تھے۔ وہ پایہ تخت دہلی جہاں مسلمان صدیوں تک حکمران رہے تھے وہ لال قلعہ، وہ تاج محل، وہ قلعہ معلیٰ سب کہاں گئے ہیں وہ بڑی بڑی درگاہیں جن کے پاس لوگ مرادیں لینے جاتے تھے اب وہ خود بے مرید پڑی ہیں مسلمانوں کے ان تاریخی آثار میں سے کچھ بھی نہ بچ سکا۔ اب وہاں کوئی ایک یاتری کوئی ایک مرید اور کوئی ایک صوفی بھی نظر نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیائے ہندوستان کا پورا نقشہ کسی بالاتر قوت نے توڑ پھوڑ کر کچھ سے کچھ کر دیا ہے پھر وہ لوگ جو ہمارے

اپنے ساتھی تھے خدا معلوم ان کا کیا حشر ہوا جو کل تک وہاں کے مکین اور صاحبِ مکان تھے آج کہاں ہیں کدھر ہیں کس کو کہاں پکارا جائے۔ ممتاز صاحب اپنی پوری خاندانی فوج کے ساتھ کدھر گئے نانی اماں کہاں ہیں کوثر اور اس کے بیوی بچے اور رمال کہاں چلے گئے اور تہار اسپتال اب کہاں ہے۔ وہ چاندنی چوک اور فتح پوری مسجد کیا ہوئی" آج وہ سب لاعلمی کے پردے میں کھو گئے ہیں ہمارے لیے وہ سب تتر بتر ہو کر رہ گئے ہیں سب کو قدرت نے ایک ہی جھٹکے سے پلٹ کر رکھ دیا ہے وہ جس ہسپتال میں امی بیمار پڑی رہیں وہ جس مکان میں تم نے عمر کا ایک بڑا عرصہ گزارا۔ وہ سکول جہاں تم نے تعلیم حاصل کی۔ وہ مئو جس کے کھیت بڑے سرسبز تھے اب کیا ہوئے۔ بس اک لاعلمی کا پردہ ہے جس میں وہ سب سو گئے ہیں۔ اب وہاں اپنی دنیوی نسبت کا ایک ذرہ بھی نہیں ہے جو وہاں ہمیں جانا ہوا اگر ہوائی جہاز میں جا کر وہاں کا نظارہ کیا جائے تو جن جگہوں میں ہمارے لیے سکون ہوا کرتا تھا آج انہیں دیکھ کر ہمیں وحشت ہوگی۔

پھر وہ لوگ جو وہاں سے نکلے اور اجڑ گئے۔ کیمپوں میں ان کا وہ معیارِ زندگی کیا ہوا۔ شرم و حیا کے پردے چاک ہو گئے، اخلاق گر گئے۔ کل تک جو صاحبِ وقار لوگ تھے اب یہاں گلی کوچوں اور انجانے راستوں پر وہ کھوئے کھوئے پھرتے ہیں۔ ان کی صورتیں بدل گئی ہیں ان کے رنگ متغیر ہو گئے ہیں وہ مہذب لوگ اب خانہ بدوش نظر آتے ہیں۔ وہ تباہ شدہ انسانیت کی راکھ بن کر رہ گئے ہیں۔ یہ اس سال کا انقلابی تغیّر ہے جو صدیوں میں رونما ہوا ہے۔ یہ سال صدیوں میں سے ایک سال ہے۔

جانِ من۔ سوچو اور غور کرو کہ ان سب باتوں سے کیا معلوم ہوتا ہے؟ یہی کہ انسانوں کی قسمتوں کا مالک بالاتر قوی تر اور عظیم تر ایک باجبروت ہستی ہے سب کچھ اسی کے

ہاتھ میں ہے۔ پوری دنیا کا نظام اسی کی مٹھی میں ہے۔ وہ چاہے تو لڑائیوں سے بھی اس دنیا کو تباہ کر سکتا ہے وہ چاہے تو معمولی زلزلے کے جھٹکوں سے بھی اس جہان کو بیخ و بن سے اکھاڑ سکتا ہے۔ وہ چاہے تو بیماری کے ایک ریلے سے بھی اس دنیا کی بنیادیں الٹ سکتا ہے اور وہ چاہے تو ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر چڑھا کر اپنے سرکش بندوں کو ان کی سرکشی کی خود انہیں کے ہاتھوں سزا دے سکتا ہے۔ اسی کا قانون برحق قانون ہے۔ وہی سب سے اعلیٰ سب سے اول اور سب سے بہتر ہے۔ اسی کے اشارے پر یہ سارا عالم حرکت کر رہا ہے اور اسی کے بسائے یہ دنیا بس رہی ہے۔ یہ چونکہ دار الاسباب ہے دار الجزا نہیں ہے اس لیے بار بار انسان کو صرف جھنجھوڑ کر ہی چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ وہ سنبھل جائے اور اس دوسری دنیا کے لیے تیاری کرے جو ہمیشہ کے لیے رہنے والی ہے اور جہاں جا کر وہ اپنے یہاں کے اعمال کے مطابق اعلیٰ یا ادنیٰ زندگی بسر کریگا۔ یہاں اتفاقیہ پیدائش سے کوئی امیر بنا ہوا اکڑتا نظر آتا ہے اور کوئی غریب بن کر بلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے کوئی شاہ ہے اور کوئی گدا ہے۔ کوئی سید بنا ہوا ہے اور کوئی راجپوت ہے لیکن ایک دوسری دنیا ایسی بھی ہے جہاں اس کے اعمال کے لحاظ سے اس کے مراتب ہوں گے وہاں نہ سید کو سیادت اس لیے حاصل ہو گی کہ وہ اتفاقاً حادثۂ پیدائش کے نتیجے میں سیدوں میں پیدا ہو گیا ہے اور نہ شاہ کو شاہی اس لیے ملے گی کہ وہ حسن اتفاق سے بادشاہ کے گھر میں پیدا ہو گیا ہے وہاں ہر کسی کے درجے اس کے اعمال کے مطابق ہی بنائے جائیں گے۔ جانِ من۔ ہمیں ایسی زندگی کیلئے ہی تیار ہونا چاہیئے نہ دولت خالص عزت ہے نہ خاندان اور نسل حقیقی عزت ہے۔ نہ رنگ اور عہدہ اصل عزت ہے بلکہ حقیقی عزت تو ایمان اور تقوی ہی ہے جتنا کوئی

اللہ سے ڈرے اور اس کے احکام کی پابندی کرے اتنا ہی وہ قابل عزت ہے تم نے دیکھ لیا کہ اس تباہی کی یلغار میں نہ دولت والوں کی دولت اور نہ جائداد والوں کی جائداد اور نہ نسل والوں کی نسل انہیں ذلت و تباہی سے بچا سکی لیکن جس کے پاس ایمان کی دولت تھی وہ اس کے ساتھ ویسے ہی محفوظ چلی آئی ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے مالک سے دعا کرتے رہنا چاہیئے اور ساتھ ہی کوشش بھی جاری رکھنی چاہیئے کہ وہ ہمیں اپنے صاحب ایمان بندوں میں سے کرے، ان بندوں میں سے جو اس کے مقبول بندے ہیں اور ظالم و معتوب نہیں ہیں۔

میں نے اکثر شادی اور جذبۂ محبت کے متعلق بھی غور کیا ہے مجھے وہ زمانہ یاد ہے جب میری اور محسن انصاری کی بحثیں اس موضوع پر ہوا کرتی تھیں اور شمس مظفر پوری بھی اس میں حصہ لیا کرتے تھے۔ محسن کے خیالات مجھ سے بہت کچھ ملتے جلتے تھے محسن انصاری کی چونکہ شادی ہو چکی تھی اس لیے اس کی رائے کو میں اکثر زیادہ اہمیت دیا کرتا تھا اس کی رائے تھی جس سے مجھے بھی اتفاق تھا کہ محبت کی شادی میں "جنسی کشش" کا حصہ بہت کم ہوا کرتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ بس اندازاً دس فی صدی ہوتا ہوگا اور میں چونکہ ناتجربہ کار اور صرف نظریاتی تھا اس لیے اکثر کہا کرتا تھا کہ اس میں جنسی کشش کا حصہ زیادہ سے زیادہ پانچ فیصدی یا پھر اس سے بھی کچھ کم ہی ہوگا۔ اس لیے کہ "جنسی کشش" پہ قائم کی ہوئی محبت میں دوام نہیں ہو سکتا۔ یہ جذبہ وقتی اور ہنگامی ہے اور زندگی کے تھوڑے سے وقت سے تعلق رکھتا ہے جب کہ زندگی ایک طویل عمل ہے محسن اکثر میرے استدلال سے اتفاق کر لیا کرتا اب بھی اگرچہ میری شادی ہو گئی ہے لیکن میرا وہ نظریہ معمولی تناسب کے فرق کے ساتھ اب تک ویسا ہی قائم ہے۔ اب میرے اس نظریۂ

ہیں اسلام کا رنگ بھی داخل ہو گیا ہے اور میں اسے حقوق الزوجین کے نقطہ نظر سے بھی دیکھتا ہوں میرے نزدیک یہ رنگ بہت پاکیزہ اور معصوم ہے اس میں باہمی عزت واحترام اور ایثار وقربانی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اس تصورِ ازدواجیت میں قلب وروح کی گہرائی اور وجدان کی کشش پائی جاتی ہے اصل مطلوب شے جنس سے زیادہ وہ انسان ہوتا ہے جو رفیقِ زندگی بنا ہے اور جس کی بہت سی انسانی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت جنس بھی ہے۔ یہی وہ احساسِ رفاقت ہے جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتا ہے ورنہ جنس کی شدت تو اسی حیوانی جذبے کی یلغار ہے جو اغوا اور فواحش کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور اسلام اسے اعتدال کے راستے پر ڈالتا ہے۔

آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے اور میں یہ وقفۂ فرقت حافظ آباد میں بیٹھا ہوا تمہیں خط لکھ کر گزار رہا ہوں اور کوئی تحفہ ارسال کرنے کی بجائے مکتوبِ سالگرہ تحریر کر رہا ہوں جو لامتناہی ہے اور دل کے وسیع سمندر میں سے جذبات کے چند قطرے قلم کی تنگ وباریک نوک پر سے کاغذ پر ٹپکا رہا ہوں۔ دل میں جذبات کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور اس کی لہروں کی معمولی سی لرزش بھی میں خط میں منتقل کرنے سے قاصر ہوں اسی لیے یہ خط مکمل کرنا سخت دشوار ہو رہا ہے۔

لو ابھی ابھی دروازے کے سامنے تانگہ آ کر رکا ہے اور اس میں سے بھائی جان رشید اور چوہدری علی احمد خان اتر کر چلے آ رہے ہیں۔ مسکراتے اور باتیں کرتے ہوئے۔

آج دوپہر بھائی جان رشید اور چوہدری علی احمد خاں آ گئے ہیں۔ بھائی جان مجھے کراچی بھیج رہے ہیں انہوں نے بمبئی سے کراچی پہنچ کر ایک ہفت روزہ اخبار جہانِ نو کا ڈیکلریشن بھی لے لیا ہے تم جانتی ہو کہ وہ بمبئی سے بھی اسی نام کا پرچہ نکال رہے ہیں

تھے۔ وہ تقاضا کر رہے ہیں کہ تم میرے ساتھ کراچی چلو اور چل کر پرچہ سنبھالو وہ ایک پریس میں منیجر لگ گئے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اگر میں جہان نو کی ادارت سنبھال لوں تو تحریک کا کام بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دنوں کوئی پروگرام بھی آخری پروگرام نہیں ہے بہت سی باتیں بہت سے مشورے بہت سے نقشے اور بہت سے پلان ہیں جو بنتے بگڑتے ادھڑتے اور سنورتے رہتے ہیں۔

رات خوب دیر تک محفل جمی رہی۔ چوہدری علی احمد خاں جواب تک چاہتے تھے کہ ہم دونوں مل کر حافظ آباد میں دکان کریں تاکہ باری باری سے دین کا کام کر سکیں بھائی جان رشید کی رائے سے اتفاق کر گئے ہیں کہ مجھے کراچی جا کر اخبار نکالنا چاہیئے۔ اس نئی سلطنت میں اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد میں سب سے اہم حصہ ایک اخبار ہی ادا کر سکتا ہے۔ اخبار ہوگا تو آواز ہوگی، آواز ہوگی تو عوامی پکار ہوگی اور عوام کو اسلامی نصب العین کے لیے بیدار ہموار اور منظم کیا جا سکے گا۔

چوہدری صاحب تو یہاں تک رائے رکھتے ہیں کہ ہم دونوں کراچی چلے چلیں۔ میں اخبار نکالوں اور وہ اسے بازاروں میں فروخت کیا کریں۔ وہ کہتے ہیں کہ چاہے ہمیں وہاں سبزی کا ٹھیلہ ہی کیوں نہ لگانا پڑے لیکن اخبار ضرور جاری کرنا چاہیئے۔ جن لوگوں سے ہمیں واسطہ ہے وہ مفاد کے پورے لیکن کانوں سے بہرے ہیں جب تک ان کے کان نہ کھولے جائیں گے وہ اسلامی نظام کی بات نہیں سنیں گے۔ اس کے علاوہ عوام میں اسلامی جذبات ابھارنے اور اسلامی مطالبہ اٹھانے کے لیے بھی اخبار کی ضرورت ہے۔ اب یہ دونوں بزرگ ہستیاں مجھے بہت محبت اور اصرار سے مجبور کر رہی ہیں کہ میں کراچی جاؤں اور اخبار کا اجراء کر دوں لیکن سوال پیسے کا ہے، خانماں برباد لوگوں کے پاس پیسہ جیل

کے گھونسلے میں ماس سے بھی کم ہے۔ البتہ تمہارے زیور میں اگر تمہیں وہ اسلام سے زیادہ محبوب نہ ہوں تو وہ دین کا پرچم بن سکتے ہیں۔

تو کہو کیا کراچی جانے کے لیے تیار رہو۔ چوہدری صاحب کی رائے یہ ہے کہ پہلے تم لوگ جا کر وہاں اخبار جاری کرو جب ذرا چل جائے تو مجھے بھی وہاں بلا لو وہ بھی ہمارے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتے ہیں۔ جب تک ہم کراچی میں اخبار جاری کر کے انہیں کراچی بلانے ہیں وہ مہاجرین کے کیمپ کے امدادی کام سے فارغ ہونے کے بعد اپنے چھوٹے بھائی عبدالرحمٰن کے پاس ٹھہریں گے جو ایک بنگلہ ہتھیا اور سیٹ بابو ہے۔ جہاں تک الاٹمنٹوں کا تعلق ہے نہ انہیں اس سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہمیں کوئی دلچسپی ہے۔ یہ سارا غیر مسلموں کا مال مسلم لیگ والوں نے تو اپنے لیے مال غنیمت ہی بنا رکھا ہے لیکن مجھے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس حد تک ہمارے لیے جائز بھی ہے۔ مجھے تو ایسے مال سے دل میں بڑی گھٹن محسوس ہوتی ہے اس لیے میں نے بھی اس مال اور دکان سے ہاتھ اٹھا لینے کا فیصلہ کر لیا ہے بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے کل تک رائے پختہ ہو گئی تو سیالکوٹ میں بھائی جان سے مشورے کے لیے جاؤں گا۔

لو اب بس کرتا ہوں زبردستی قلم روکتا ہوں اس سالگرہ نمبر خط کے ساتھ میری طرف سے بھی اپنی شادی کی اس انقلابی اور انوکھی سالگرہ پر تحفۂ ہجر و فراق قبول کرو۔

حافظ آباد۔ ۲۳، نومبر ۱۹۴۷ء

۶۹

تمہیں پرسوں ہی ایک خط سالگرہ نمبر کی صورت میں لکھ کر رجسٹری کر چکا ہوں۔ بھائی جان والد صاحب کے پاس گجرات چلے گئے ہیں اور چند دنوں کے بعد آ جائیں گے۔ چوہدری صاحب لاہور مولانا محترم سے کراچی جانے کے بارے میں مشورہ کرنے کے لیے چلے گئے ہیں اور میں ابھی تک یہیں ہوں۔ بھائی جان کی واپسی پر سیالکوٹ بھائی صدیق صاحب سے مشورہ کرنے کے لیے جاؤں گا۔

آج میں تم سے مقصدِ زندگی کے موضوع پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ جب اللہ نے ہمیں ازدواج کے رشتے میں پرو دیا ہے تو لازمی ہے کہ ہم ایک دوسرے کی طلب اور اندرونی کیفیات سے واقف ہوں اور ساتھ ہی اس بڑی حقیقت سے بھی آگاہ ہوں جو مسلمان کے نصب العین کی حیثیت سے ہمارے لیے ہر چیز سے عزیز تر ہے۔ جب ہم نے اپنا سب کچھ ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا ہے تو ہمارے لیے ایک دوسرے سے مکمل آگاہی ضروری ہے تاکہ ہم زندگی کے ہر شعبے میں ایک دوسرے کے قدم کے ساتھ قدم ملا کر چل سکیں۔ ہمارا نصب العین ایک واضح حقیقت ہے جس پر مسلمانوں کی غفلت نے بہت سے پردے ڈال دیئے ہیں وہ نصب العین اسلامی نظام زندگی کا قیام ہے۔ یہ نصب العین حاصل کرنے کے لیے پیش قدمی ضروری ہے اور اس پیش قدمی کے لیے اسلامی تحریک کا شعور اور اس سے وابستگی بھی ضروری ہے۔ جب ہم یہ مانتے ہیں کہ اس ساری دنیا کا مالک وہی ایک اللہ ہے تو گویا ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ

اس کی دنیا میں قانون بھی اسی قادرِ مطلق کا جاری ہونا چاہیئے۔ خدا کا طبعی قانون تو دنیا میں ہر طرف چل ہی رہا ہے۔ فطرت کے ان قوانین میں کسی بڑے سے بڑے فرعون کو بھی ترمیم کی نہ جرأت ہے نہ گنجائش ہے اور نہ ہی اس سلسلے میں انسان کسی مواخذے کا پابند ہے البتہ زندگی کا وہ حصہ جس میں خدا نے انسان کو خود مختار رکھا ہے اس میں خدا کا شرعی قانون جاری کرنا اس پر لازم ہے۔ جو یہ کام نہیں کرتا وہ چاہے ایک فرد ہو یا پوری قوم ہو اس سے مسلمان کی لڑائی ہے اس لیے کہ مسلمان خدا کو اس دنیا کے لیے قانون بنانے والا اور مالک و قادر مانتا ہے۔ یہ بات ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنے ذمے کا فرض ادا کرے۔ جب ہم پورے شعور کے ساتھ مسلمان ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں تو فوراً ہی ہم پر یہ فرض بھی عائد ہو جاتا ہے کہ ہم دنیا میں دوسرے تمام جھوٹے خداؤں کی خدائی کو توڑ کر صرف اپنے وحدہٗ لاشریک خدا کی خدائی قائم کریں۔ تمام جھوٹے قوانین ختم کر کے خدا کا قانون نافذ کریں اور اس راہ میں ہم وہ سب کچھ نثار کر دیں جو خدا نے ہمیں امانت کے طور پر دیا ہے معمولی محنت سے لے کر جان تک اور ایک پیسے سے لے کر زندگی کی ساری کمائی تک کامیابی یا ناکامی کا ٹھیکہ ہمارا نہیں ہے بلکہ کوشش کرنا ہمارا کام ہے اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے

"ام حسبتم ان تدخلو الجنۃ ولما یا تکم" (الخ)

یعنی "کیا تم سمجھتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تمہاری وہ حالت نہیں ہوئی جو تم سے پہلے لوگوں کی ہوئی تھی۔ ان پر بھوک آئی بیماری آئی اور وہ ہلا مارے گئے یہاں تک کہ پیغمبر اور اس کے ساتھی چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی خبردار اللہ کی مدد نزدیک ہے"

یہ وہ کسوٹی ہے جس پر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو پرکھتا ہے کوئی یہ سمجھے کہ وہ تسبیحوں کے ہلانے سے یا سجدوں کی تعداد بڑھانے سے یا صرف ہُو حق کے نعرے لگانے سے جنت میں چلا جائے گا تو یہ اس کے شیطان کا دھوکا ہے۔ یہ زندگی تو محض ایک چھوٹی سی آزمائش ہے تم ذرا اپنا ماضی دیکھو تو سب باتیں کل کی معلوم ہوتی ہیں کہ تم مٹو بیں تھیں اور چڑیوں سے کھیلتی تھیں آج تم باشعور ہستی ہو۔ انسانی زندگی یوں ہی گزر جاتی ہے وہ لوگ خوش قسمت ہیں جو اپنی اس چھوٹی سی زندگی میں اپنا فرض پہچانتے اور تاویلوں میں نہیں الجھتے ہیں۔ مسلمان کی زندگی کا مقصد خدا کے قانون کو دنیا میں نافذ کرنے کا عزم ہے ہر وہ شخص اس مقصد کا دشمن ہے جو اپنا بنایا ہوا قانون چلانا چاہتا ہے چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، یہ کوئی سہل کام نہیں ہے یہی وہ کام ہے جس کے عوض خدا اپنے بندوں کو جنت کی بشارت دیتا ہے۔

اس مقصد کو لے کر اٹھنے والا ہر شخص چاہے وہ عورت ہو یا مرد، یہ اچھی طرح جان لے کہ یہ راہ کوئی پھولوں کا راستہ نہیں ہے بلکہ کانٹوں کی باڑھ ہے، اس راہ میں بھوک بھی ہے تنگ دستی بھی ہے اور تکلیف درد اور مشقت بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جب ہم اس نصب العین کو لے کر اٹھ کھڑے ہوں تو وہی لوگ جو ہماری صرف باتیں سن کر ہم سے اتفاق کرتے ہیں کل ہمارے مخالفوں کی صف اول میں ہوں وہی ہم پر لاٹھی چارج کریں وہی ہمیں ہتھکڑیاں پہنائیں اور وہی ہمیں جیلوں میں لے جا کر ڈال دیں یہی لوگ جو آج مسلمانوں کے بڑے ہمدرد بنتے ہیں اپنے سارے ہتھیاروں کے ساتھ ہمارے مقابلے میں آ جائیں اس لیے کہ اس قانون کے اجراء سے ان کی خدائی پر چوٹ پڑتی ہے۔ کسی کو عہدہ عزیز ہوتا ہے اور کسی کو ذرائع معاش اور خاندان عزیز ہوتے ہیں چنانچہ خدا کا کلمہ بلند کرنے والے پر، ہر شخص

اپنے اپنے بت کو بچانے کے لیے دوڑ پڑتا ہے اور وار کرنے لگتا ہے۔

میں نے عزم کر لیا ہے کہ میں اس ملک میں ایسے لوگوں میں شامل ہو کر کام کروں گا جو اللہ کا قانون نافذ کرنے کے لیے اٹھیں گے چاہے وہ کوئی بھی ہوں میں اپنے رب سے اس کی توفیق طلب کرتا ہوں۔ میں چند دنوں سے اس مسئلے پر خصوصاً بہت غور کر رہا ہوں اس لیے کہ پاکستان بن گیا ہے اور اب ملک میں اسلامی تحریک چلنے کا وقت بہت قریب ہے جو لوگ مصلحت پسند ہیں وہ تو صرف امیدوں کے سہارے پر بیٹھے رہیں گے لیکن جنہیں آگے بڑھ کر اللہ کا کلمہ بلند کرنا ہے انہیں تو بہر حال حضرت امام حسینؓ کی سنت پر عمل کرنا ہوگا۔ امام حسینؓ اپنے بہتر ساتھیوں کے ساتھ دین کے لیے ڈٹ گئے تھے اس عظیم عزم میں میں تنہا نہیں رہنا چاہتا۔ زندگی کے ہر شعبے میں تم میرے ساتھ ساتھ ہو اور میری رفیق ہو۔ بلاشبہ دین کے لیے کام کرنے کا آزادانہ فیصلہ کرنے کا تمہیں حق حاصل ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اس کام میں میرا ساتھ دو۔ جب بھی میں نے اپنے آپ کو اس مشکل کام کے لیے تولا ہے تو مجھے سب سے پہلے تم ہی یاد آئی ہو کبھی کبھی مجھے ڈر لگتا ہے کہ اگر تم میرا ساتھ نہ دو تو پھر کیا ہوگا۔ پھر کیا ہوگا۔ کہیں میں لڑکھڑا نہ جاؤں۔ کہیں محبت اور فرض میں ٹکر نہ ہو جائے۔ اس خیال سے میں کانپتا ہوں اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے ایسی آزمائش میں نہ ڈالے اس لیے کہ میں نے زندگی میں تم سے بہت سی توقعات باندھی ہیں میرا حال تو ہمیشہ یہی رہا ہے کہ اگر میرے پاس ایک پیسہ بھی نہ ہو تب بھی مجھے کسی کی پروا نہیں ہوا کرتی اور اگر بہت سے ہوں تب بھی اس کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ الحمد للہ کا شکر ہے کہ دولت کے پھندے سے میں بلند ہوں نہ کسی کی دولت نے مجھے کبھی مرعوب کیا ہے اور نہ کسی کی دنیوی بڑائی نے۔ اس لیے کہ اسلام کے نزدیک انسان اور انسان میں فرق

کرنے کا معیار دولت یا نسل یا قوم نہیں بلکہ تقویٰ اور اخلاق ہے اس لیے میں صرف اس شخص کی زیادہ عزت کرتا ہوں جو خدا ترس ہو میرے نزدیک بڑی تنخواہ یا کار اور کوٹھی معیارِ عزت نہیں ہے بلکہ بڑی خدا ترسی ہی معیارِ عزت ہے۔

میں اگر خدا کے قانون کے اجراء کے لیے جدوجہد کرتا ہوں تو یہ بڑا کارِ ثواب ہے۔ آخرت اس سے سنور جائے گی اس جدوجہد میں ہو سکتا ہے کہ میں جیل چلا جاؤں یا لمبی سزا پا جاؤں یا اسلام کو غالب کرنے کے جرم میں باطل نظام کے پہرے دار مجھے بغاوت کے جرم میں گولی یا پھانسی کی سعادت سے بہرہ ور کردیں اگر ایسے حالات آ جائیں تو میں دیکھوں گا کہ تم اپنے فرض کو کس طرح ادا کرتی ہو اور کہاں تک میرا ساتھ دیتی ہو۔ تم اگر میرے ساتھ ہو تو پھر میرے لیے دوزخ بھی بہشت ہے اور اگر تم میرا ساتھ نہ دو گی تو پھر میری قوت آدھی رہ جائے گی۔ بس یہی اندیشہ کبھی کبھی مجھے پریشان کرتا ہے کہ کہیں محبت فرض سے ٹکرا نہ جائے خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔ تم نے اگر اس سے پہلے سنجیدگی سے اس موضوع پر غور نہیں کیا تو میں کہوں گا کہ اب تم سنجیدگی سے غور کرو۔ تم نے بہت کچھ پڑھ لیا ہے خود مجھے بھی پڑھ لیا ہے اب مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں زندگی کا یہ مصرف منظور ہے یا نامنظور ہے۔ تاکہ میں صحیح طور پر اندازہ لگا سکوں کہ اس وقت میری کیا پوزیشن ہے۔ خدا کرے تمہاری رفاقت مجھے زندگی کے ہر نشیب و فراز میں نصیب رہے لیکن اس میں جبر کی کوئی بات نہیں ہے اس لیے کہ ہر شخص اپنے اپنے دائرۂ اعمال میں آزاد اور خود اپنے خدا کو اپنا مواخذہ دینے والا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ میں خود تم سے ملنے کیلئے جلد آؤں میرے نزدیک یہ معاملہ بہت اہم ہے۔

حافظ آباد ۲۵، نومبر ۱۹۴۷ء

۷

اللہ کا شکر ہے کہ تم نے خواتین میں کام کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور وہاں خواتین میں کام کا آغاز بھی کر رہی ہو اور اس کے لیے میرا مشورہ طلب کر رہی ہو۔ تم محلے کی خواتین کو جمع کر کے اجتماع کا انتظام کرنا چاہتی ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

یہ حقیقت ہے کہ لوگ تو ہمارے عمل کو ہمارے قول سے ہی ناپتے ہیں۔ اگر ہم دعوے تو اونچے کریں لیکن عمل میں کوتاہ ہوں تو لوگوں کی نظر دل میں ہمارے قول کی کوئی وقعت نہ ہوگی۔ دنیا کے یہ لوگ تو فانی ہیں ان کی ہمیں کیا پرواہ، خود اللہ تعالیٰ کی نظر میں بھی ایسے قول کی کوئی قیمت نہیں ہوتی جو بے عملی پر مبنی ہو۔ ہماری زندگی ایک تحریک کی زندگی ہے، ایک جدوجہد کی زندگی ہے، ہم ان کیڑوں مکوڑوں کی مانند نہیں ہیں جو پیدا ہوتے، روٹی کماتے، بچے پیدا کرتے، اور پھر مر جاتے ہیں ایسے لوگ چاہے بڑی سے بڑی دولت کما لیں وہ حشرات الارض کی صف سے آگے نہیں بڑھتے اس لیے کہ جو کام قدرت نے انسان خصوصاً مسلمان کے ذمے لگایا ہے اگر وہ اسے ادا نہ کرے تو پھر کمانے آرام کرنے اور نسل پیدا کر کے مر جانے سے وہ دوسرے جانداروں سے کسی صورت بھی افضل نہیں ہو سکتا۔

تم اجتماع کرنا چاہتی ہو بہت نیک ارادہ ہے اس کے لیے تم اپنے محلے کی خواتین کی فہرست تیار کر دو پھر ان کے نام فرداً فرداً مندرجہ ذیل خط لکھ کر بچوں کے ذریعے ان تک پہنچا دو۔

"عزیز بہن .... دین اسلام کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لیے ہم چند بہنیں کام کر رہی ہیں۔ دین کا کام مرد تو بڑھ چڑھ کر کر رہے ہیں۔ لیکن ہم عورتوں میں غفلت پائی جاتی ہے۔ ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم جمع ہو کر دین کی راہ میں جد و جہد کرنے کا پروگرام بنائیں اور اپنا اسلامی فرض ادا کرنے کی کوشش کریں اس لیے کہ قیامت کے روز ہر مرد اور ہر عورت کو اپنا اپنا حساب اپنے خدا کے سامنے خود دینا ہوگا۔

اس مقصد کے لیے ہم نے خواتین کا ایک اجتماع .... کے مکان پر بروز .... بجے منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس میں قرآن و حدیث کا درس بھی ہوگا۔ آپ سے درخواست ہے کہ اجتماع میں شرکت فرما کر ممنون فرمائیں"۔

یہ خط ملازم یا بچوں کی معرفت محلے کے مختلف گھروں میں تقسیم کرا دیا جائے۔ پھر تم قرآن کا ایک رکوع دوبارہ پڑھ کر اچھی طرح تیاری کر لو اور ساتھ ہی خطبات میں سے ایک خطبہ بھی اچھی طرح پڑھ لو دو تین احادیث بھی کسی حدیث کی کتاب میں سے چھانٹ لو۔ جس کتاب کی بھی ضرورت ہو آپا جی کی کتابوں میں سے مل جائے گی۔ درس قرآن اور مطالعہ کے بعد پھر سب خواتین جو موجود ہوں مل کر دین کے کام کے بارے میں سوچیں اور پروگرام بنائیں سب سے پہلے باہمی تعارف ہونا ضروری ہے تاکہ بے تکلفی پیدا ہو اور جھجک نہ رہے مناسب تو یہ ہے کہ فرداً فرداً ہر خاتون سے مل کر اس کا نام اور اس کی خیریت بھی پوچھی جائے۔ اس سے اپنائیت پیدا ہوتی ہے یہ کام تمہیں بلا جھجک کرنا چاہیئے پھر عام دینی معلومات، اور حالات کے بارے میں بات چیت کرنا چاہیئے اور پھر آئندہ ہفتہ کے لیے پروگرام بنا لینا چاہیئے۔ جو بہنیں پڑھی لکھی ہوں ان کو بھی پڑھنے کیلئے کتب دینا چاہیئے اور ان سے اجتماع میں بھی کام لینا چاہیئے۔ دین کے اس کام میں دل

ہیں سے ہر قسم کا احساسِ کمتری نکال دینا چاہیئے - دین کے کام سے بڑھ کر دنیا کا دوسرا کوئی کام معزز نہیں ہے اور تبلیغِ دین سے بڑھ کر بڑی کوئی نیکی نہیں ہے. تم اپنے اس پہلے اجتماع کی رپورٹ مجھے ضرور لکھنا تاکہ میں مزید مشورے دے سکوں -

اب ہمیں غالباً کراچی ہی جانا ہوگا لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم وہاں حلقۂ خواتین قائم کردو تمہارے بعد پھر وہ چلتا رہے گا اور جب تم وہاں سے چلی بھی جاؤ گی تو اس اجتماع میں کام کا ثواب تمہیں صدقۂ جاریہ کی طرح مستقل ملتا رہے گا.

مجھے یقین ہے کہ اب تم ایک کامیاب اجتماعِ خواتین منعقد کر کے وہاں ایک حلقۂ خواتین قائم کردو گی مناسب ہو کہ ایک دو اجتماعات کے بعد کسی تعلیم یافتہ خاتون کو ناظرۂ حلقہ بھی بنا دو تاکہ تمہارے جانے کے بعد وہ آئندہ اجتماعات کراتی رہے.

اللہ تعالےٰ تمہیں اپنے دین کے کام کے لیے سمجھ شعور اور جوش و ولولہ عطا فرمائے بس یہ سمجھ لو کہ اب ہمارے پاس وقت بہت ہی کم رہ گیا ہے بہت جلد انقلابی اقدامات کرنے کا وقت سر پر آپہنچا ہے -

حافظ آباد - ۲ . دسمبر ۱۹۴۷ء

---

(۷۱)

آج چوہدری علی احمد خان لاہور سے واپس آئے ہیں انہوں نے بتایا ہے کہ مولانا محترم نے اخبار کے اجراء کی تجویز کو بہت پسند کیا ہے . البتہ مولانا کی

رائے ہے کہ ابھی چوہدری صاحب کراچی نہ جائیں، صرف میں تنہا چلا جاؤں اور کام کا آغاز کروں چنانچہ میں اور چوہدری صاحب کل صبح بھائی جان صدیق الحسن سے تفصیلی تبادلۂ خیال کرنے کے لیے سیالکوٹ جا رہے ہیں تاکہ ان کے سامنے ساری اسکیم رکھ دی جائے اور ان سے کراچی جانے کی اجازت حاصل کر لی جائے۔ اس صورت میں حافظ آباد کی سکونت ترک کردینی ہوگی اور اپنے سارے منصوبے کراچی اور اخبار کے ساتھ منسلک کرنے ہوں گے۔ بہرحال جو فیصلے ہوں گے تم ان سے بے خبر نہ رہو گی اس لیے کہ تم میرے ساتھ ساتھ ہو اور ہمیں مل جل کر زندگی کا سارا ہفت خواں طے کرنا ہے۔ بس صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہم اس زندگی میں سے زیادہ سے زیادہ آخرت کی کمائی کر کے لے جائیں اس لیے کہ مستقل رہائش کے لیے آخرت کو ہی مخصوص کیا گیا ہے یہ دنیا تو مسافر خانہ ہے جیسے سرگودہا حافظ آباد میں بھی اسٹیشنوں پر مسافر خانے پائے جاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ میں سیالکوٹ سے واپسی پر سیدھا سرگودہا آجاؤں۔ بس دعا کرتی رہو۔

حافظ آباد — ۵۔ دسمبر ۱۹۴۷ء

۷۲

تم حیران ہو گی کہ میں تمہیں یہ خط لاہور سے لکھ رہا ہوں۔ اور وہ بھی مہاجرین کے امدادی کیمپ سے۔

بھائی رشید صاحب تو گجرات سے سیدھے کراچی جا چکے ہیں اور مجھ سے جلد از جلد کراچی پہنچنے کا تقاضا کر رہے ہیں۔ پرسوں ہی بھائی جان سے مشورے کے لیے میں اور چوہدری علی احمد خان حافظ آباد سے سیالکوٹ چلے گئے تھے۔ ایک دن ان کے پاس ٹھہرنے اور مفصل گفتگو کرنے کے بعد وہاں سے سیدھے لاہور چلے آئے ہیں۔ میں یہاں چند دن رہ کر چوہدری صاحب کے ساتھ مہاجرین کے امدادی کیمپ میں کام کروں گا تاکہ اس بلکتی سسکتی انسانیت کے دکھ درد میں شرکت کے اجر سے محروم نہ رہوں۔ اسی لیے میں چوہدری صاحب کے ہمراہ سیالکوٹ سے حافظ آباد یا سرگودہا جانے کی بجائے لاہور چلا آیا ہوں اس طرح ہمیں مولانا محترم سے ملاقات اور مزید مشورہ کا موقع بھی مل جائے گا۔ اب یہ خط تمہیں مہاجرین کے کیمپ سے ہی رات کو بیٹھا تحریر کر رہا ہوں۔ ابھی ابھی بہت سا سامان تقسیم کر کے آیا ہوں اور ابھی دوسرے رفقاء تقسیم سامان کا کام کر رہے ہیں۔ میرے ذمے جو کام تھا اسے میں نے جلد مکمل کر لیا ہے اور تمہیں خط لکھنے کے لیے یہ مہلت نکال لی ہے آدھی رات کو کمبل تقسیم کرنے کے لیے پھر ہمیں کیمپ کے دورے پر جانا ہے۔

سیالکوٹ میں بھائی جان سے بات چیت خوب ہوئی اخبار نکالنے کی تجویز سن کر وہ بھی بہت خوش ہوئے اور ہم رات بھر باتیں کرتے رہے۔ اگرچہ حافظ آباد میں مکان اور دکان کا انتظام ہو گیا ہے اور اب ہم پھلور میں شروع کی ہوئی تجارت کو یہاں بہتر طور پر اطمینان سے آگے بڑھا سکتے ہیں خصوصاً جب ایک مناسب دکان بھی مل گئی ہے اور موزوں مکان بھی مہیا ہو گئے ہیں۔ ایک حلقۂ احباب بھی وہاں پیدا ہو گیا ہے اور کام میں مدد اور مشورے دینے والے ہم خیال دوستوں کا بھی اصرار ہے کہ ہم حافظ آباد میں ہی

ٹھکانہ بنائیں، اس طرح حافظ آباد میں سارے ہی اسباب سازگار ہیں اور اگر ہم یہاں جم کر بیٹھ جائیں تو توقع ہے کہ دعوتی کام کے مواقع بھی یہاں کافی موجود ہیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس چھوٹے سے قصبے میں ہم پھلور کی سی فضا پیدا کر سکتے ہیں لیکن .... اور یہ "لیکن" ہمارے درمیان بہت طویل بحث کا موضوع بنا رہا۔ ہم رات بھر مختلف زاویوں سے سوچتے رہے۔ ہم تینوں ہی اس بات پر متفق تھے کہ اگر دعوتی کام کو وسیع بنیادوں پر سر انجام دینا ہے، وسیع تر اثرات پیدا کرنے ہیں، دعوت کو پُراثر اور ملک گیر زبان مہیا کرنی ہے، ایک ہی شہر نہیں بلکہ پورے معاشرے اور حکومت کے سامنے کلمۂ حق بیان کرنا اور دعوتِ دین پیش کرنا ہے تو ایک تحریکی اخبار پر سینکڑوں دکانوں اور ان کی کمائیوں کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح حافظ آباد میں میرے دو ماہ کے مسلسل قیام، محنت دوڑ دھوپ اور یہاں مستقل ٹھکانہ بنا کر رہنے کے لیے مہیا کردہ اسباب کے خلاف ہم تینوں نے متفقہ ووٹ دے دیا۔ تحریکی ذہن ہمیشہ ذات کے مقابلے میں مقصد کو سامنے رکھتا ہے، چوہدری صاحب کے جذبات کا تو یہ عالم تھا کہ وہ بچوں کو کہیں بٹھا کر کراچی آنے اور اس دعوتی اخبار کو گلیوں میں خود سائیکل پر فروخت کرنے کے لیے تیار تھے بس ذرا اخبار کے چل جانے کا وہ انتظار کرنا چاہتے ہیں۔ بھائی جان کا بھی خیال ہے کہ جیسے ہی اخبار جاری ہو اور اس کے کچھ شمارے اپنے دعوتی رنگ میں ان کے سامنے آئیں تو وہ بھی ملٹری اکاؤنٹس میں اپنے سپرنٹنڈنٹ آف اکاؤنٹس کے عہدے سے استعفیٰ دے کر کراچی چلے جائیں اور اخبار کے انتظامی امور سنبھال لیں تاکہ دعوتِ اسلامی کی اس جذبہ انگیز زبان کو رواں دواں رکھا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ ان حضرات کے ان پرجوش جذبات کی موجودگی میں حافظ آباد میں میرے مزید قیام کا کیا امکان باقی رہ گیا ہے اس طرح تہیں

اب حافظ آباد لانے کا سوال بھی تقریباً ختم ہو جاتا ہے۔
اس وقت رات کے دس بج رہے ہیں اور سارا کیمپ سردی کی شدید لہر کی زد میں ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد لٹے پٹے قافلے چلے آ رہے ہیں پریشان حال مرد، چیختے، چلاتے بچے، سسکتی سمٹتی عورتیں، کراہتے ہوئے زخمی، دم توڑتے ہوئے مریض، ننگ دھڑنگ لوگ، روتے بلکتے لڑکے لڑکیاں، بین کرتی ہوئی بوڑھی عورتیں، سوکھے مریل مویشی، ٹوٹے پھوٹے لڑکھڑاتے چھکڑے، ایک عجیب و غریب دردناک درد انگیز درد افروز دنیا ہے جس کے درمیان میں یہاں بیٹھا ہوں معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کا سماں ہے اور مردے قبروں کے لحاف الٹ الٹ کر بیٹھ گئے ہیں اور حیرانی و پریشانی کے عالم میں چاروں طرف دیکھ رہے ہیں کہ وہ کس نئی دنیا میں آ گئے ہیں۔ اب اس ہجوم غمزدگان میں کون جانتا ہے کہ کون کیا ہے، کدھر سے آیا ہے، کس مرتبے، کس درجے، کس شرف و اعزاز، کس قابلیت، کس خاندان، کس قبیلے اور کس پائے کا آدمی ہے۔ جس طرح بھیڑوں کے گلے میں کوئی بھیڑ نمایاں نہیں ہوتی، اسی طرح اس مرگ انبوہ کے انبوہ مرگ میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ کون زیادہ ضرورت مند ہے۔ کون کم ضرورت مند ہے کون جانتا ہے، کون پہچانتا ہے۔ کوئی کسی کو نہیں جانتا، کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔ آدم کے بچے بچیاں باہمی لڑ جھگڑ کر لٹے پٹے یہاں آ پڑے ہیں اور ان کو ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا۔ جس طرح آدم و حوا زمین پر بالکل اجنبی تھے اور انہیں زمین پر کوئی نہ جانتا تھا اسی طرح یہ سب بھی باہمی اجنبی ہیں اور ان میں سے کوئی بھی کسی کو نہیں جانتا۔ دلگداز واقعات کا ایک اندوہناک سلسلہ ہر ایک کی زندگی کے ساتھ کانٹوں کے ہار کی طرح آویزاں ہے۔ یہاں ہمیں روزانہ ایسے واقعات سے دوچار

ہونا پڑتا ہے کہ کسی خاندان کا سربراہ کیمپ میں فوت ہو گیا ہے تو اس کے کفن دفن سے بچنے کے لیے اس کے گھر والے اس کی میت اٹھا کر دوسری طرف رکھ دیتے ہیں اور منہ پھیر کر بیٹھ جاتے ہیں اور پوچھنے پر کہہ دیتے ہیں کہ یہ لاوارث ہے۔ ایسے وارثوں کی لاوارث لاشیں ہم بیسیوں کی تعداد میں دفن کر چکے ہیں۔ جہد للبقائنے تنازع للبقاء کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ لوگ مرنے والوں کے کپڑے اتار لیتے ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کا سامان جو انہیں تقسیم کیا جاتا ہے چرا لیتے ہیں۔ لوگ ضرورت کا سامان لے چکنے کے باوجود دوسری بار تقسیم کے وقت پہلا سامان چھپا کر دوبارہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ لوگ خوشامد کرتے اور اپنے ضمیر کو ذلت سے دوچار کرتے ہیں۔ لوگ خاندانی روایات کو بالائے طاق رکھ کر اپنے بچوں تک کو بیچ دیتے ہیں۔ یہاں ایسی صورت حال بھی سامنے آئی ہے کہ بوڑھی طوائفیں اپنی دوکانوں پر تازہ مال سپلائی کرنے کے لیے اس بیابانِ مرگ سے لوگوں کی جوان لڑکیاں خرید کر لے گئی ہیں۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ قوم جس نے اپنی آزادی لڑ کر نہیں حاصل کی ہے بلکہ سیاسی حالات کے تغیر سے آزادی اس پر آپڑی ہے، آزادی کے اس چکر میں سے گزرتے ہوئے اپنے اخلاق کے کیسے کیسے اندوہناک پہلو اس دنیا کے سامنے نمایاں کیے ہیں۔ جب تک یہ زخم مندمل نہ ہوں گے اس سے کسی صحت مند اور آزاد قوم کی سی روایات قائم کرنے کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ یہ مہاجرین تو مصیبت زدہ ہیں، مقامی لوگوں نے جس جس طرح غیر مسلموں کے مال و جائداد و آبرو کو لوٹا ہے اور حرام کے مال سے اپنے گھر بھرے ہیں اور اجڑ کر آنے والے اپنے مہاجر بھائیوں کے آنے سے پہلے پہلے غیر مسلموں کی ہر شے سمیٹ کر اپنے گھروں میں ڈالنے کی کوشش کی ہے اس کی داستان کیا بیان کروں۔ یہ کسی قوم کی داستان

زوال وانحطاط تو ہو سکتی ہے کسی قوم کی آزادی و حریت کی داستان نہیں ہو سکتی۔

تو ایسے حالات ہیں جن میں یہاں کام ہو رہا ہے۔ چوہدری صاحب اس کیمپ کے انچارج ہیں۔ بہت سے رفیق دور و نزدیک سے آئے ہوئے ہیں۔ محبوب شاہ ہاشمی سرگودھا سے۔ ڈاکٹر عبدالمجید دریا خان مری سندھ سے۔ ڈاکٹر نذیر احمد ڈیرہ غازیخان سے ماسٹر عطاءاللہ سرگودھا سے، روز نئے نئے ساتھی آکر کام کرتے ہیں اور چند دن کام کر کے چلے جاتے ہیں۔ تحریک اسلامی سے وابستہ لوگوں نے خود مہاجر و مجبور ہونے کے باوجود ہر قسم کی اپنی ذاتی ضروریات سے بے نیاز ہو کر جس طرح یہاں کام جاری کیا ہوا ہے یہ خدا کے ہاں بڑے اجر، خلق کے ہاں بڑی ستائش اور اور تحریک کے لیے بڑے روشن مستقبل کا نشان ہے۔

نفسا نفسی سے بھرپور اس عالم مہاجرت میں کمبلوں کا بھرا ہوا ایک ٹرک کسی ادارے کی طرف سے تقسیم کے لیے آیا ہے اور وہ ہمارے نظام خدمت پر اعتماد کرتے ہوئے ہمیں دے گیا ہے کہ آپ لوگوں پر ہمیں زیادہ اعتماد ہے۔ آپ ہی تقسیم کریں۔ اب سارا کیمپ ان کمبلوں کے لیے منتظر ہے۔ ان میں حقیقی ضرورت مند اور غیر حقیقی ضرورت مند کا امتیاز کرنا ریت اور خشخاش کو علیحدہ علیحدہ کرنا ہے چنانچہ ہم نے یہی مشورہ کیا ہے کہ رات کو بارہ بجے جب سارا کیمپ سو رہا ہو اور جب اس سردی میں کوئی شخص بھی اپنی اوڑھنے کی کوئی شے بچا کر یا چھپا کر اپنا ضرورت مند ہونا ثابت کرنے کے لیے سردی سے ٹھٹھرنے کی جسارت نہیں کر سکتا، ہمارے کارکن کمبل کندھوں پر لاد کر کیمپ کا گشت کریں اور جس جس لیٹنے والے کو سردی سے ٹھٹھرتا اور سکڑتا ہوا دیکھیں اس پر سوتے ہوئے کمبل ڈالتے چلے جائیں اس طرح تھوڑی سی دیر

میں سارے کیمپ میں مکمل تقسیم بھی ہو جائیں گے اور حقیقی ضرورت مند تک پہنچ بھی جائیں گے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تجویز بہت بہتر رہے گی اور دن کے وقت تقسیم کے ہنگامے سے بھی ہم بچ جائیں گے ۔

اب ہمارے ذمے دودھ کی تقسیم کا کام بھی لگ گیا ہے ۔ ہم سے پہلے مسلم لیگ کے ہاتھ میں تقسیم کا یہ کام تھا ۔ آج صبح ہی صبح سابق منتظمین کا ایک ملازم جگ لیے ہوئے آیا کہ سابق کیمپ انچارج نے اپنے کارکنوں کی چائے کے لیے دودھ کا ایک جگ منگوایا ہے چوہدری صاحب نے ٹکا سا جواب دے دیا کہ مہاجرین کا دودھ کارکنوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا بازار سے منگوالیں ۔ وہ بے چارا اپنا سا منہ لے کر واپس چلا گیا ۔

سب سے مشکل کام یہاں سے لاشیں اٹھانا اور انہیں مراسم تجہیز و تکفین کے بعد دفنانا ہے ۔ کوئی ادارہ یہ کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہے بالآخر یہ کام بھی ہمارے ہی ذمے لگایا گیا ہے اور ہمارے کارکن یہ کام جس دل گردے سے کر رہے ہیں یہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانیت کی خدمت سارے کاموں سے افضل ہے اور اسی لیے اللہ تعالےٰ نے اپنے حقوق کے ساتھ ساتھ اپنے بندوں کے حقوق ادا کرنے کی طرف بھی مومنین کو توجہ دلائی ہے ۔ مشہور ابراہیم ادہمؒ خدمتِ خلق سے ہی ولایت کے درجے تک جا پہنچے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کو راہِ راست کی طرف دعوت دینا اور انہیں بگاڑ کے راستے سے ہٹا کر سلامتی کے راستے کی طرف لانے کا کام خدمت خلق میں سب سے افضل درجے کی خدمت ہے ۔

آج دوپہر مولانا محترم بھی تشریف لائے تھے ۔ کیمپ میں ذرا دیر بیٹھے ۔

ان سے بھی کراچی سے اخبار کے بارے میں چلتے چلاتے چوہدری صاحب نے مشورہ کیا تھا۔ میری بھی ان سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اخبار والی تجویز کو بہت پسند کیا ہے اس طرح اس اسکیم پر مولانا محترم نے بھی مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔

اچھا بھئی اب بہت دیر ہو گئی ہے۔ ہمارے ساتھیوں کا ایک گروپ اب سامان تقسیم کر کے واپس چلا آ رہا ہے ان میں چوہدری صاحب کی آواز بھی سنائی دے رہی ہے۔ پھر ہمیں تھوڑی دیر بعد کمبلوں کی تقسیم کے لیے جانا ہے۔ اس لیے ختم کرتا ہوں۔

لاہور - ۱۵، دسمبر ۱۹۴۷ء

۷۳

سیالکوٹ سے لاہور چوہدری صاحب کے ساتھ مہاجرین کے امدادی کیمپ میں کام کرنے کیلئے چلا گیا تھا وہاں سے ایک خط لکھا تھا مل گیا ہوگا کیمپ میں ایک ہفتہ کام کر کے آج واپس آیا ہوں۔ تھکان سے چور چور ہوں لیکن تمہیں خط لکھنے سے پہلے نیند آنا مشکل ہے۔ بس کے اڈے سے اتر کر ہوٹل سے کھانا کھا کر آیا ہوں۔ نمازِ عشاء پڑھ کر بیٹھا ہوں۔ کئی دنوں کی ڈاک جمع پڑی ہوئی دروازے میں ملی ہے۔ جس میں تمہارا سرگودھا سے آیا ہوا خط اور بھائی جان رشید احمد کا کراچی سے آیا ہوا خط دونوں سب سے نمایاں ہیں۔ دونوں کو سب سے پہلے کھولا ہے اور دونوں کو پڑھ کر حالات سے آگاہی ہوئی ہے۔

بھائی جان نے کراچی پہنچ کر پرچے کی تیاریاں شروع کر دی ہیں کاتب سے بات کر لی ہے۔ دفتر لے لیا ہے۔ ہماری رہائش کا انتظام دفتر کے عقبی حصے میں کر لیا ہے اور اب وہ بلا تاخیر ہمیں جلد از جلد کراچی پہنچنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ بلکہ ہمارا بے تابی سے انتظار کر رہے ہیں۔ انہوں نے

لکھا ہے کہ تنہا نہ آؤ بہتر ہے کہ زبیدہ کو بھی ہمراہ لیتے آؤ تاکہ یکسوئی اور انہماک سے پرچے کا اجراء کیا جا سکے۔
تم بھی میرا انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہو اور لوریت کے اس مقام پر ہو جہاں آدمی مزید انتظار کرنے اور اس انتظار کے لیے مزید عذرات سننے کے موڈ میں نہیں ہوتا۔

تو لو بی زبیدہ اب کراچی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ شاید حافظ آباد سے یہ میرا آخری خط ہو۔ شاید مہلت انتظار طلب کرنے والا بھی میرا یہ آخری خط ہی ہو۔ شاید دُور بیٹھ کر وقفۂ فرقت کو طول دینے والا بھی یہ میرا آخری خط ہی ہو۔ اب تو صورت یہ نظر آتی ہے کہ

؎ کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
میری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

بلکہ اب ہماری نگاہ کراچی کی طرف ہے جو پاکستان کے قیام کے بعد اس کا دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے ایک تازہ بستی ہے جو کبھی گندم برآمد کرنے کیلئے ماہی گیروں کی ایک چھوٹی سی بندرگاہ تھی اب وہ مملکتِ اسلامیہ پاکستان کی وہ تازہ بستی بن کر نمودار ہو رہی ہے جہاں کلمۂ حق گونجے گا اور جہاں سے اسلامی نظامِ حیات کا آوازہ بلند ہو گا۔

بس اب آیا کہ آیا۔ چند دن مجھے حافظ آباد کے مسائل سمیٹنے میں لگیں گے۔ یہاں کے دو ماہ کے قیام میں دوستیاں، تعلقات اور روابط کا ایک جال سا بن گیا ہے۔ مکانات جو لیے گئے ہیں متعلقہ لوگوں کو واپس کروں گا۔ کچھ سامان جو فوری ضرورت کے لیے کیمپ والوں نے دیا ہے اسے بھی لوٹاؤں گا۔ چند احباب جو بن گئے ہیں ان سے الوداعی ملاقاتیں کروں گا۔ وہ احباب جنہوں نے ہمارے قیام، ابتدائی رہائش اور دوسرے امور میں تعاون کیا ان کا شکریہ بھی ادا کروں گا۔ حکیم محمد شریف صاحب، پروفیسر اسرار احمد خاں غلام محمد بٹ اور علی بہادر خان جیسے محبّ حضرات سے اجازت حاصل کروں گا اور پھر حافظ آباد کو خدا حافظ کہہ کر سیدھا سرگودھا پہنچوں گا۔ تم تیار رہنا۔ سرگودھا سے

ہی پروگرام بنا کر بھائی جان کو کراچی تار دے دیں گے۔ اور پھر اس عروس البلاد میں جا کر باطل کے خلاف جھنڈے گاڑ دیں گے۔

اس طرح پنجاب سے اب بوریہ بستر لپیٹ لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اگر مقصدِ زندگی کیلئے کوئی کام کرنا ہے تو وہ کسی کونے میں بیٹھ کر دنیا کمانے سے نہیں ہوگا بلکہ تبلیغ دین کیلئے نعرہ حق بلند کرنے سے ہوگا اور حقیقت یہ ہے کہ آج کے اس دورِ نشر و اشاعت میں اخبار اگر حق کی آواز بن سکے تو اس سے بڑا نعرۂ حق اور کون سا ہو سکتا ہے۔

میں نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ دین کی سربلندی کیلئے نعرۂ حق ہی بلند کروں اور پاکستان میں اسلامی نظام کے اجراء کی مؤثر کوشش کیلئے اخبار کا اجراء کروں۔ میرے پاس جو کچھ قلم کی قوت ہے اور جو اس سے پہلے بہت کچھ ترقی پسند ادیبوں کی نگارشات کے رُخ پر صرف ہوتی رہی ہے اس کا کفارہ ادا کروں۔ جہانِ نو کا اجراء انشاء اللہ ملک میں آگے بڑھتی ہوئی تحریک اسلامی کیلئے مہمیز کا کام کریگا اور حقیقت یہ ہے پاکستان خود ایک جہانِ نو ہے جو ایک عظیم تخریبی عمل سے تعمیر کی صورت بن کر نمودار ہوا ہے۔ جہاں ہند کا تختۂ ارض ٹوٹا ہے۔ تب یہ سیارۂ نو طلوع ہوا ہے۔ قوم خون کے سمندر میں سے گزری ہے تب یہ بیش بہا موتی اپنے عزم کی جھولی میں سمیٹ کر لائی ہے۔ پاکستان کے نام کا کوئی ملک جغرافیے میں موجود نہ تھا لیکن جغرافیہ اس کی پیدائش کیلئے بدل گیا ہے تاریخ میں اس کا ذکر کہیں نہیں ملتا لیکن تاریخ نے اس کیلئے اپنا ایک نیا باب کھول دیا ہے۔ دنیا کی مملکتوں میں اس نام کی کوئی مملکت نہ تھی لیکن یہ نئی مملکت ایک نرم و نازک کونپل کی سی قوت سے زمینِ حقیقت کا سینہ چاک کر کے صفحۂ ہستی پر نمودار ہو گئی ہے۔ یہ درحقیقت وہ جہانِ نو ہے جو اسلام کی اندرونی قوت کے نسب لیے وجود میں آیا ہے اور ہمیں اسے اسلام کی خاطر اور اسلام کیلئے آباد و شاداب بنانا ہے اس کے لیے ہمیں پنجاب سے ایک اور ہجرت کراچی کیطرف کرنی ہوگی۔ اس نیت سے ہم کراچی جائینگے تو ہمیں ہری ہجرت کا ثواب ملے گا۔

پاکستان بلاشبہ جہانِ نو ہے۔ لیکن یہ اسی خطۂ ارض کا ٹکڑا ہے جس پر انگریز نے ڈیڑھ صدی تک حکومت کی ہے۔ اس کا حصول بلاشبہ اسلام کی داخلی قوت کا عظیم معجزاتی مظہر ہے لیکن اس کے کارپرداز اپنی تعلیم و تربیت کے اعتبار سے اسلامی تصورِ حیات سے بے بہرہ اور بے خبر ہیں۔ ان سے یہ توقع بہت کم ہے کہ وہ خود بخود اسلام کی اطاعت و اجراء کا اہتمام کریں گے۔ اگر کریں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں عظیم اجر دے گا اور ہمارا خادمانہ تعاون انہیں حاصل ہوگا لیکن اگر وہ انحراف کا راستہ اختیار کریں گے اور خاکم بدہن مجھے بہت ہی بڑا اندیشہ ہے کہ وہ ضرور انحراف کا راستہ ہی اختیار کریں گے اس

لیے کہ عمرِ فاروق کا تصورِ مملکت ان حضرات کے تصورِ مملکت سے بہت مختلف تھا۔ عمرؓ کے نزدیک اسلام عقیدہ ایمان اور واجب الاطاعت دین تھا لیکن ان حضرات نے اسلام کو اب تک اپنی زندگیوں سے دور دور ہی رکھا ہے اور اسے دین واعتقاد کی بجائے بس اپنی سیاسی پالیسی کے طور پر ہی استعمال کیا ہے۔ بہرحال ہم مستقبل کے حالات سے بہتری کی توقع رکھیں تو بھی ایک آوازۂ حق، جو خلیفۃ المسلمین کو بھی ٹوک کر ان کے کرتے کی لمبائی پوچھ سکے قوم کے ضمیر کی آواز اور زندگی کے طور پر اس کا وجود بہت ضروری ہے اور انشاءاللہ وہ ہمارا یہ اخبار ہی ہوگا جس میں میں اپنی صلاحیتیں قوتیں اور محنتیں صرف کروں گا۔ راتوں کو جاگ کر اور دن کو بھاگ کر بھی۔

پاکستان خاک و باد و آب کا جہانِ نو ہے تو میرا یہ اخبار جذبہ و نظریہ کا جہانِ نو ہوگا۔ میں مولانا رومؒ کی بنسری کی طرح اس میں اپنی روح کی آواز پھونکوں گا اور اسے خدا کے بندوں کیلئے مدافعت اور خدا کے دشمنوں کیلئے دہشت بنا دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرا ساتھ دو گی۔ اخبار نویس ہمارے معاشرے میں اخلاص و افلاس کا امتزاج ہے۔ جہاں اخلاص ہوگا وہاں افلاس ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے مقصدِ زندگی کیلئے آنیوالے حالات کا رخ برداشت کرو گی۔ اس طرح تمہاری تعلیم بھی تمہارے کام آئے گی۔ ایک ہفتہ وار اخبار چلانے کے لیے بھی ایک ٹیم کی ضرورت ہوتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہم دونوں مل کر ایک ٹیم بن سکتے ہیں۔ میں ایڈیٹر سے لے کر ایک چپڑاسی تک کا کام کر سکتا ہوں اور تم پتوں کی سلپیں لکھنے سے لے کر حسابات رکھ سکتی ہو۔ اس طرح ہم پاکستان میں ایک نئی آواز بلند کریں گے جو فہم و شعور کے ساتھ ساتھ جذبہ و جوش کی علمبردار ہوگی۔ ہم پاکستان میں سے فرنگی کے چھوڑے ہوئے استعماری نشانات مٹائیں گے اور پرچمِ محمدی بلند کریں گے اور انشاءاللہ ہماری جدوجہد سے وہ جہانِ نو پیدا ہوگا جس میں فرنگی کے تسلط کے آثار معدوم ہو کر نشانات نظامِ اسلامی نمودار ہوں گے اور ہماری جدوجہد کے نتائج دیکھ کر ہر شخص یہ کہہ سکے گا کہ

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا تھا قمار خانہ

حافظ آباد۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۴۷ء (آخری خط)

اشاریہ

الف

ت

ٹ

ج

چ

ص

ط

ع

غ

ف

ادبِ اسلامی پبلیکیشنز

- نوجوانوں کے لیے تفریحی ادب کا مرکز
- اِسلام کی سربلندی کا فکری سرچشمہ
- اسلامی تحریک کا روحِ رواں
- اُردو ادب میں انقلابی رجحانات کا علمبردار
- نئی نسل کی اصلاح کے لیے اس ادارے کے ساتھ تعاون کیجیے۔